قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1966

سچّے موتی

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا۔

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔

اس لئے،

اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

(ابو داؤد)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

عربی خود سیکھئے

طلوع اسلام کی کوششوں کی بدولت قوم کے نوجوان طبقہ کے دل میں قرآن کریم کی طرف رجوع ہونے کا شوق پیدا ہوا تو یہ تقاضا بھی سامنے آیا کہ قرآن مجید کو خود سمجھنا چاہیے ۔ اس کے لیے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے ۔ ادارہ طلوع اسلام کی مدت سے خواہش تھی کہ ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب شائع کی جائے جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن مجید باسانی سمجھ میں آ جائے ۔ للہ الحمد کہ وہ کتاب اب شائع ہوگئی ہے ۔ اس کا نام ہے ۔

عربی خود سیکھئے

عام اشاعت کی غرض سے اسے چیپ ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت فی جلد صرف اڑھائی روپے ۔ جلد منگا لیجئے ۔

ناظم ادراہ طلوع اسلام
۲۵/ب ۔ گلبرگ ، لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

بدلِ اشتراک

پاکستان
سالانہ ــــــ دس روپے

ہندوستان
سالانہ ــــــ پندرہ روپے

غیر ممالک سے
سالانہ ــــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ★ ہندوستان
ایک روپیہ ــ ڈیڑھ روپیہ

(خط و کتابت کا پتہ)
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔
۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۹ — اکتوبر ۱۹۶۶ء — نمبر (۱۰)

فہرستِ مضامین

(۱) لمعات ــــــــــــــــــــ ۲

(۲) خدا ــ اور ــ سرمایہ دار ــــــــ (پرویز صاحب) ــــــــ ۱۷

(۳) بھارت کا عالمی کردار ــــــــ (خورشید عالم صاحب) ــــــــ ۴۱

(۴) باب المراسلات ــــــ زر۔ زمین۔ زن ــــــــ ۴۹

(۵) خوش بختی دستک دے رہی ہے ــــــ (یوم انقلاب کی یاد میں) ــــــ ۵۷

(۶) رابطۂ باہمی ــــــ (یوم الفتح کا جشن) ــــــ ۷۲

(۷) حقائق و عبر ــــــ (فحاشی کے سرچشمے) ــ (چھوتی موتی کا اسلام) ــ (پاک فضائیہ کا مبارک اقدام) ــــ ۷۵ تا ۸۰

ایڈیٹر: صفدر سلیمی۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سوال در سوال

اشاعتِ حاضرہ کے لمعات (طلوعِ اسلام کی عام روش سے ہٹ کر) مشتمل ہیں ایک باہر کے مقالہ پر، — مقالہ نگار ہیں، محترم نعیم صدیقی صاحب (جو جماعتِ اسلامی کے غالباً پبلسٹی سیکرٹری ہیں) مقالہ شائع ہوا ہے جماعتِ اسلامی کے آرگن — ہفت روزہ "الیشیا" کی ۱۳ ستمبر کی اشاعت میں۔ اور اس کا عنوان ہے — سوال در سوال — طلوعِ اسلام کی طرف سے آخر میں، اس سوال در سوال کا جواب پیش کیا جائے گا۔ وہ مقالہ یہ ہے۔

"سید قطب دار پر پہنچے، سر دیا اور سرفراز ہو گئے۔ دنیا کے لحاظ سے ایک ٹریجیڈی اور آخرت کے لحاظ سے کامیڈی مکمل ہو گئی۔

لوگ مرتے ہیں، ہر روز مرتے ہیں، ہر طریقے سے مرتے ہیں اور بے شمار مرتے ہیں۔ موت کی تگ و تاز کہاں نہیں — بحر و بر میں، کوہ و جبل میں، جھونپڑیوں اور محلوں میں، ریلوں اور کاروں میں، جہازوں اور طیاروں میں، ہسپتالوں اور آپریشن تھیٹروں میں، سڑکوں پر اور چوراہوں میں — موت کوئی اجنبی چیز نہیں۔ زندگی اور موت توام ہیں جس دن، جہاں کہیں جس روپ میں بھی زندگی نمودار ہوتی ہے۔ اسی دن موت ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ لگ جاتی ہے۔

سو مرنا کوئی اچنبے کی بات نہیں۔ آج سید قطب مر گئے، کل نعیم صدیقی کو بھی مرنا ہے اور جمال عبدالناصر کو بھی، اور ان سب کو بھی جنہیں کبھی یہ یاد نہیں آتا کہ ایک دن انہیں مرنا ہے۔ سید قطب کی مظلومانہ شہادت پر مجھے ہی نہیں، کرۂ ارض کے لاکھوں باشندوں کو دکھ ہوا، مگر میرا دکھ آہستہ آہستہ ایک سوال میں بدل گیا۔

سوال یہ ہے کہ آدمی کی فطرت اتنی قاتلانہ کیوں ہے، وہ اتنا خونخوار اور خونریز کیوں ہے، چند لاکھ برس کے تہذیبی تجربوں اور تعلیم و تفکر اور فلسفہ طرازیوں اور جمالیاتی ارتقا کے باوجود وہ آج بھی اپنے قابیلی کردار سے نجات نہیں پا سکا۔ آؤ۔ اسے ویٹ نام میں دیکھو، اسے قبرص اور فلسطین میں دیکھو، اسے بھارت اور کشمیر میں دیکھو، اسے مغربی اور مشرقی جرمنی میں دیکھو، اسے رہوڈیشیا میں دیکھو، اسے اریٹریا میں دیکھو۔ اسے نائیجیریا میں دیکھو، اسے امریکہ، روس اور جاپان میں دیکھو، اسے ترکی، ایران، یمن اور انڈونیشیا میں دیکھو اور اسے پاکستان میں بھی دیکھو ۔۔۔ عام سماجی زندگی سے لے کر سیاسیات و اقتصادیات تک میں، اور بین الاقوامی کشاکش میں بھی۔

کسی ملک، ملت کی تمیز کے بغیر پوری کی پوری انسانیت کو دیکھو (جس میں اچھے نمونے بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں) اس پورے قافلے پر نظر ڈالو۔ ہائے! یہ مجد و شرف کا قافلۂ تہذیب جو ہر قدم پر آپس میں گتھم گتھا ہو رہا ہے، یہ وقت کی جس وادی سے گزرتا ہے اس میں لاشوں کے انبار چھوڑ کے گذرتا ہے، یہ جہاں پڑاؤ کرتا ہے وہاں خون کی ندیاں جاری ہو جاتی ہیں، اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدتوں جاری رہتی ہیں۔ یہ جس بستی سے گزرتا ہے اس کی مقدس ترین عمارتوں کو آگ لگا کر کھنڈروں میں بدل دیتا ہے۔ اس کے نقوشِ قدم اگر ہیں تو بس مزار اور قبریں ہیں!

آخر یہ کیا؟ کیوں ہے؟

بعض لوگوں کی وفات بلکہ شہادت اپنے ساتھ یہی برکت رکھتی ہے کہ ان کی میتیں سوچنے والے انسانوں کے لئے ایک علامتِ استفہام بن جاتی ہیں۔ سقراط جب زہر کا پیالہ پیتا ہے، عیسٰی علیہ السلام کے لئے جب یہود کے اجارہ دارانِ مذہب سزائے موت تجویز کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ کا لہو جب قرآن کے اوراق پر گرتا ہے، اور حضرت امام حسینؓ کا سر جب نیزے پر اٹھایا جاتا ہے، امام مالکؒ، احمد حنبلؒ، اور امام ابوحنیفہؒ پر تازیانے برستے ہیں تو بیشمار دلوں میں سوال ابھرتے ہیں۔

آج سید قطب کی شہادت نے میرے دل میں بھی بے شمار سوال پیدا کر دیئے ہیں، باہم گر الجھے ہوئے سوال! آج صبح میں ان سوالوں کی گچھیوں کو سلجھانے بیٹھا ہوں، میں انہیں الگ الگ کر رہا ہوں۔

بجلی کا ایک بوسیدہ پنکھا چل رہا ہے، میرے قریب ہی دوسرے پلنگ پر ننھی نوزیہ بتول سو رہی ہے۔ رات کی رانی کے پودوں کی خوشبو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ سرخ گلاب کے پھول زینتِ صبح ہیں اور چند بھولی بھالی کرنیں، ان سے کھیل رہی ہیں۔ چڑیوں کی چہکار کے درمیان ایک بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے اور مجھے

میرے سوال تنگ کر رہے ہیں، جیسے ہر سوال پھانسی کا پھندا ہے، جیسے میں زندگی کے تختۂ دار پر کھڑا ہوں۔ جیسے میری گردن گھٹ رہی ہے، جیسے میرا آخری سانس ختم ہو گیا ہے، جیسے میری لاش میرے سامنے رکھی ہے اور وہ لاش پھر سوال کی شکل میں زندہ ہو جاتی ہے اور میرا گلا پھر گھٹنے لگتا ہے۔

اور ہم سب کے سب اپنے جانے اور انجانے سوالوں کے پھندے میں اپنی اپنی گردنیں گھٹتے محسوس کرتے ہیں۔ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سوال صدیوں سے ہمارے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں اور جب تک ہم ان کا جواب مہیا نہیں کرتے یہ ہمارا گلا گھونٹتے رہیں گے، ہمارا خون بہاتے رہیں گے اور ہماری لاشوں کے ڈھیر لگاتے رہیں گے۔

میرے سامنے بیسیوں حسن البنا ہیں، سینکڑوں عبدالقادر عودہ اور سید قطب ہیں۔ ہزاروں عدنان مندریس اور ابوبکر تفاوی بلیوی اور احمد و بیلو ہیں اور یہ ساری مقدس میتیں جیسے میرے دل میں خون کی گیخ ہیں۔ اور ہر میت کے مرقد میں سے ایک شجرِ استفہام اُگ آیا ہے۔ معلوم نہیں وہ سوال کیا کیا ہیں؟ معلوم نہیں انہیں کیسے بیان کیا جائے؟

ایک بات جو مجھے پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ ساری لہولہان کیوں ہے؟ ہمارا سارا سرمایۂ ملی آخر زخم ہی زخم کیوں ہے؟ ہماری ساری کمائی لاشوں اور میتوں کی شکل میں کیوں ہے؟ کوڑے، تازیانے، سولیاں، پھانسیاں، زنجیریں، بیڑیاں، زہر کے پیالے، سازشیں، دھوکے، زیادتیاں، تشدد، جبریت! ــــ وہاں سے یہاں تک ہم مسلمانوں کی شان سب سے نرالی ہے۔

اپنوں سے لڑائی، اپنوں کی گردنیں کاٹنا، اپنوں پر ستم توڑنا، اپنی ہی قوت کا ستیاناس کرنا، اپنے بہترین جوہرِ قابل کو غارت کرنا، اپنے ہی اعضاء کو کاٹتے چلے جانا۔ آخر یہ کیا تماشا ہے؟

کیا ہم پاگل ہو گئے ہیں؟ ہم میں عقل نہیں ہے؟ ہم اپنے بھٹکے ہوئے قافلۂ تاریخ کا رُخ بدل نہیں سکتے؟ کیا ہمیں ہمیشہ اسی طرح خانہ خراب رہنا ہے، کیا یہ ہماری اٹل تقدیر ہے؟

کوئی عالم و مفکر جانتا ہو تو بتائے کہ ہم مسلمان اپنے ہی دین کے خلاف کیوں معرکہ آرا چلے آ رہے ہیں؟ حضرت امام حسینؓ سے لے کر سید قطب تک جب کبھی کوئی فرد یا گروہ دعوتِ دین کو اجتماعی دائرے میں لے کر آیا تو اس کی مزاحمت کے لئے کفر و شرک کی طاقتیں نہیں بلکہ مسلمانانِ کرام ہی کی صفیں آگے میدان میں اترتی رہی ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اور کیا یہ معقول رویّہ ہے؟ قابلِ فہم بات ہے؟ اور اگر یہ سب ٹھیک ہے جو ہو رہا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تو پھر میرے سوال کا دوسرا رُخ سامنے آجاتا ہے کہ آخر ہم وہ سب کچھ کر کے مسلمان بننے پر بضد کیوں ہیں۔ سیدھی طرح کیوں نہیں ہم یہ طے کر لیتے کہ اسلام کا گٹھڑ ہم سے نہیں اُٹھ سکتا۔ مسلمانیت کا کھڑاگ ہمارے بس کا روگ نہیں۔

ترکِ اسلام بھی کریں گے اور مسلمان بھی رہیں گے۔ اسلام کے ایک ایک اصول کو پامال بھی ضرور کریں گے اور اسلام پر احسان بھی ضرور دھریں گے۔ نظریئے اور نظام غیروں سے مستعار لے کر پلیٹ پر لا دینے کو سرمایۂ فخر بھی سمجھیں گے اور پھر جھوم جھوم کر اسلام کی شان میں قصیدے بھی پڑھیں گے۔

یہ سب کیا ہے؟ — یہ سب کیوں ہے؟

سورج ذرا سا بلند ہو گیا ہے۔ میں خیال ہی خیال میں سیّد قطب کی لاش کو آہستہ سے مس کر رہا ہوں، میں اس منحوس تختۂ دار کو تصوّر میں محض اس لئے چوم رہا ہوں کہ اس تختے پر سیّد قطب کے قدم چند لمحوں کے لئے ٹکے تھے۔ سفرِ آخرت کو طے کرتے ہوئے قدم! آخری قدم!!

اور اِدھر میرے کان کے پردوں سے اس واعظِ سادہ لوح کی آوازیں ٹکرا رہی ہیں جو اخوان کو غلط کار ثابت کر رہا تھا اور سیّد قطب اور ان کے ساتھیوں کو مجرم گردان رہا تھا اور غصے کا لاوا ہوا میں انڈیل رہا تھا اور خوشی سے جھوم رہا تھا، کہ چند ایسی ہستیاں اس دنیا سے کم ہو گئیں جن کا نقطۂ نظر اس واعظ سے مختلف واقع ہوا تھا۔

اور دور سب سے دور ایک اور خطیب عیّار کی آواز میرے دماغ میں کیل بن کر ٹھک رہی ہے جس نے اس ناقابلِ فراموش تاریخی حادثے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا، کہ ہمیں چونکہ کچھ معلوم نہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے اور نہ ہمیں کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق ہے، لہٰذا ہمیں چُپ رہنا چاہیئے کاش خطیب صاحب چُپ رہ سکتے، جانتے بوجھتے جھوٹ بولنا اور وہ بھی خانۂ خدا کے منبر سے!

ہائے یہ منبر والوں اور دار والوں کا فرق!

خطیبِ محترم اور واعظِ شیریں مقال! ذرا تھوڑی دیر کے لئے اپنے ضمیر میں ڈوب کر سوچئے کہ خدانخواستہ اگر آپ پر بھی وہی کچھ گذر جاتے جو سیّد قطب پر گذری ہے۔ اسی طرح کا الزام لگے، اسی طرح سے تشدّد کیا جائے اسی طرح کی ڈرامائی عدالت ہو، اسی طرح دو منٹ میں فیصلہ ہو جائے۔ اسی طرح آپ کی رفیقۂ حیات تڑپ رہی ہوں، آپ کی بہنیں بین کر رہی ہوں، آپ کے معصوم بچے بلبلا رہے ہوں، آپ کا سارا گھر اور خاندان اجڑ کر رہ جائے

(اللہ کرے کہ ایسا کسی کے ساتھ نہ ہو) تو فرمایئے کہ کیا آپ دار کے تختے پر کھڑے ہو کر اپنے اسی طرزِ فکر کو برقرار رکھ سکیں گے جو آج آپ نے منبر پر پیش فرمایا ہے کیا آپ کو پھر بھی یہی پسند ہوگا کہ تمام دنیا گنگ پڑی رہے اور کسی طرف سے آپ کے لئے کوئی آواز بلند نہ ہو؟

حضرت! یہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ظلم ہوا ہے اور آج کی دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ڈھایا جاتا ہے وہ دور دور رہنے والوں سے مخفی نہیں رہ سکتا جس طرح ہماری آنکھیں واقعات کو صاف صاف دیکھ رہی ہیں آپ کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہیں مگر آپ نے اپنے ضمیر کے منہ میں مٹی بھر دی ہے۔ آپ نے ظلم کا ساتھ دیا ہے اور مزید ایک ظلم کیا ہے۔

کیا آپ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی خدا کا خوف باقی نہیں رہا؟

میری توجہ اس سراپا حرکت و حرارت قسم کے دوستوں کی طرف بھی جا رہی ہے معلوم نہیں وہ سب کے سب خاموش کیوں ہیں۔ ان پر سکتہ کیوں طاری ہے؟ وہ کس کافی ہاؤس میں وقت کی گزرتی ہوئی گھڑیوں سے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں گے؟ وہ جو دنیا کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر انقلابی لے میں ہنگامے اٹھایا کرتے ہیں۔ وہ آج کس غار میں پناہ گزیں ہیں؟

میرا خیال ہے کہ وہ تقریب مسرت منا رہے ہوں گے۔

آج اگر کسی روزن برگ جوڑے کو گیس چیمبر میں داخل کیا جا رہا ہوتا یا کسی لومبا کو قتل کیا جا رہا ہوتا، تو آپ لاہور اور کراچی میں ان کے جذبات کا طوفان امنڈتا دیکھتے۔

سید قطب کے پھانسی پانے سے انہیں کیا دلچسپی؟ خدا پرست اور مذہب پسند طاقت جتنی کم ہو جائے ان کی نگاہ میں اچھا ہے۔ ان کے ناپسندیدہ نظریات کے حاملین کو انصاف سے سزائے موت دی جائے یا ظالمانہ یا مکارانہ طریق سے۔ ان کے لئے دونوں صورتیں یکساں قابلِ خیر مقدم ہیں۔

آج جبکہ پاکستان ہی میں نہیں، دنیا بھر میں بے شمار مسلمانوں کے سینے زخمی ہیں، ان سنگدل حضرات کے پاس چار اچھے لفظ بھی نہیں ہیں جن سے بنا ہوا مرہم ہمدردی پیش کر کے یہ اپنے آپ کو انسانیت کے بہتر معیار تک پہنچا سکیں۔

خیر سید قطب جیسی شخصیتوں سے محبت رکھنے والے اور ان کو مظلومانہ شہادت کا صدمہ سہنے والے اس سے بھی بلند ہیں کہ وہ کسی مخالف اسلام عنصر سے نمائشی ہمدردی کی بھیک لینے پر تیار ہوں۔

جاؤ۔! اے تاریخی شعور کے وارثو! ہاں سید قطب کی شہادت اور اخوان المسلمون کے ابتلا پر

جتنی خوشی منا سکتے ہو مناؤ، ناچو اور گاؤ، ایسے لمحے کبھی کبھی نصیب ہوتے ہیں۔

ہاں تو سوالات کا وہ سلسلہ باتوں باتوں میں الجھ کر رہ گیا۔

پیارے مفکرو! دانشورو! مجھے بتاؤ کہ قرونِ اولیٰ کے سوا ہماری تاریخ میں جبریت کا سکہ کیوں چلا ہے اور آج بھی دیس دیس میں یہ دستور چل رہا ہے۔ ہماری تاریخ کا بڑا حصہ بادشاہوں اور جنگ جوؤں اور فاتحین اور سازشیوں کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ ہمیں وہ لوگ کامیابی کی منزل تک پہنچتے نظر نہیں آتے جو دلیل سے کام لیں، دل و نظر کو تبدیل کریں اور صبر سے لمبا کام کر کے کوئی نتیجہ پیدا کریں۔ ایسے لوگ اٹھے اور بار بار اٹھے، مگر جبریت پسند طاقتیں ہر بار ان کو کچل کر آگے بڑھ گئیں۔ آج بھی کسی ملک میں کوئی ایک مثال ایسی موجود نہیں کہ کوئی شخص اور گروہ کسی بھی نظریئے کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ لے کے اٹھے اور صبر سے معلمانہ اور مبلغانہ کام کا طویل راستہ طے کرے اور محبت انسانیت کے مقام سے اپنے بھائیوں کو فلاح کی طرف بلائے۔

آپ کا مذہبی تصور کچھ ہوا کرے، قدیم سے قدیم ہو یا جدید سے جدید۔ بلکہ آپ کا مطمع نظر اسلام کے بجائے فرض کیجئے، اشتراکیت ہو یا کوئی اور بلا۔ آپ تعلیم و استدلال کے راستے پر ثابت قدمی سے کیوں نہیں چلتے؟ آخر ساری دنیا میں اور سارے عالم میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہ لوگ کہیں فوجی طاقت کے ذریعے، کہیں بیرونی امداد کے بل پر، کہیں مغالطہ انگیز پروپیگنڈے کے زور سے، کہیں خفیہ سازشوں کے ساتھ سے، کہیں مسلح بغاوت کے ذریعے سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہیں اور پھر جبر کی تلوار سونت لیتے ہیں اور سنگین قوانین کو حرکت میں لاتے ہیں اور اختلاف کی ہر آواز کو جائز و ناجائز طریقوں سے ختم کر دیتے ہیں۔ اس "نیک کام" کے لئے اگر انہیں خون ریزی کرنی پڑے، تو اس سے دریغ نہیں کرتے۔

جا کے دیکھو۔ آج ایک ملک ایسا ہے کہ جہاں ۴۰،۳۰ ہزار افراد سیاسی وجوہ سے جیلوں میں پڑے ہیں۔ ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں ابھی ۵ ہزار سیاسی قیدی کئی سال کی مصیبت بھگت کر باہر آئے ہیں۔ ایک ملک ایسا ہے جہاں قریبی عرصے میں کئی لاکھ افراد سیاسی ہیر پھیر میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں۔

مجھے ہر طرف بے شمار سید قطب دکھائی دے رہے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایک سیاسی لیڈر، دوسرے سیاسی لیڈر سے، ایک جماعت دوسری جماعت سے، ایک مولوی دوسرے مولوی سے، ایک صحافی دوسرے صحافی سے، ایک ادیب دوسرے ادیب سے جب اختلاف کرتا ہے تو گویا قیامت آجاتی ہے۔

میرا ایک سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے اختلافات کو محبت بھرا، دلچسپ اور پیارا پیارا کھیل کیوں نہیں بنا سکتے؟ آخر افہام و تفہیم کے بجائے غیظ و غضب کیوں؟ بحث و نظر کے بجائے مجادلہ و مناظرہ کیوں؟ دلیل کے بجائے گالی کیوں؟ شریفانہ طرزِ گفتگو کے بجائے بازاری اندازِ بیان کیوں؟ دوسرے کو قائل کرانے کے بجائے اس کی زبان بندی کی سعی کیوں؟ ہر کوئی اپنی امکانی قوت سے دباؤ ڈال کر دوسرے کو رام کرنے پر بضد ہے۔

تیرہ صدیوں میں ہمیں اختلاف کا خوبصورت اور صحت مندانہ انداز ہاتھ نہ آیا؟ تیرہ صدیوں میں ہم اختلاف کو اپنے لئے رحمت نہ بنا سکے۔

میں نے ایک ایسا خاندان بھی دیکھا ہے جس میں بیک وقت ایک صاحب کانگریس کے لیڈر تھے دوسرے مسلم لیگ کے تیسرے کمیونسٹ تھے، چوتھے کچھ اور! اور یہ سب لوگ یکجا تھے۔ اچھی طرح ملتے جلتے تھے، ہنستے بولتے تھے۔ انہوں نے کبھی ایک دوسرے کا گریبان نہیں نوچا، کبھی ہاتھا پائی نہیں کی، کبھی ایک دوسرے کو ختم کرنے کی تدبیریں نہیں سوچیں بس ہر کوئی اپنے اپنے طریق کار پر اپنا اپنا کام مثبت انداز سے کرتا تھا۔

کیا ہم بحیثیت ملت ایک ایسا خاندان نہیں بن سکتے جو اختلاف بھی کرے اور متحد بھی رہے، آپس میں بحث و تنقید بھی ہو اور چہرے بھی خنداں رہیں!

یہ کیا مصیبت ہے کہ ہر کوئی دوسرے کو مٹا دینے کے درپے ہے۔ کچا چبا جانا چاہتا ہے ہر کسی کی خواہش ہے کہ بس وہی وہ رہے اور اسی کی ایک آواز ہو، کسی دوسرے کی کوئی آواز سنائی نہ دے اور کسی دوسرے کا وجود دکھائی نہ دے۔

ہمارے ہاں کے قیمتی سے قیمتی آدمی حریفوں کے اسی اندھے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے۔ بے شمار جانیں لی گئیں، بے شمار قوتیں ضائع کی گئیں، کتنے ہی اہل علم اور اصحابِ فکر ختم کر دیئے گئے۔ کتنے ہی روشن کردار مٹا دیئے گئے۔ سروں کی فصل ہمیشہ کٹتی رہی۔ لاشوں کے انبار کھلیان میں ڈالے جاتے رہے اور لہو سے پیالے بھر بھر کے شبہائے عیش و اطمینان منائی جاتی رہیں مگر ہر شب عیش کی سحر آکے رہی اور کھیل

جیتنے والے بھی آخر شکست کھا کر دامن جھاڑتے ہوئے رخصت ہو گئے۔
ہماری اس مزمن بیماری کا کوئی علاج ہے یا نہیں ؟

سیّد قطب کی مقدس لاش سولی پر لٹکی ہوئی بار بار میرے سامنے آتی ہے اور بار بار ایک نیا ایک سوال ابھار دیتی ہے۔

قربانیاں اور اتنی بے اندازہ قربانیاں شروع سے آجتک ۔ اب قربانیوں کا کوئی حساب نہیں اور ہماری تاریخ کا ایک یہی سرمایہ فخر ہے۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ کافر قوموں نے ہم سے کم قربانیاں دے کر آزادی اور جمہوریت کی کھلی فضا حاصل کر لی مگر ہم اتنی بیش بہا قربانیاں مسلسل ساڑھے تیرہ صدیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں اور ان کے باوجود ہم ساری دنیا میں اسی طرح جبریت کے گھیرے میں ہیں جیسے مدتوں پہلے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا قومی مزاج اتنے لمبے تجربے سے گزرتے ہوئے خوگر جبریت اور استبداد پسند ہو گیا ہے۔

ان سوالوں کو سوچتے ہوئے آپ کے دل میں کہیں خدانخواستہ دبے پاؤں مایوسی نہ آ داخل ہو کم سے کم میرے دل میں سیّد قطب کی لاش کو ـــــ اور اس کے پس منظر میں ایسی ہزاروں لاشوں کو دیکھتے ہوئے بھی مایوسی کا کوئی پرتو نہیں ہے۔ مایوسی تو ایسی فرارگاہ ہے کہ جہاں سوال پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں تو بہرحال سوال سامنے لا رہا ہوں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان سوالوں کو جو مدتِ دراز سے ہمارے ساتھ چلے آرہے ہیں ہم نے کبھی توجہ کے حصہ نہیں دیا، ہم نے ان پر غور نہیں کیا، ہم نے ان کے حل تلاش نہیں کئے۔ ہم نے اس پہلو سے اپنے بھاری فرائض سے روگردانی کی ہے اور اسی کی سزا ہم ہر سرزمین پر بھگت رہے ہیں۔

کاش! کہ اب ہم سوچیں اور ان سوالوں کو حل کریں جو ہم سب کے لئے پھانسی کے پھندے بن گئے ہیں جو ہمارا گلا گھونٹ رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ہم چلتے پھرتے بھی دار پر لٹکے ہوتے ہیں " (ختم شد)

مقالہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئی ہوں (پبلسٹی کے فن کا یہی کمال ہے) اس کے اس گوشے کو چھوڑیئے اور صدیقی صاحب نے جو سوالات اٹھائے ہیں انہیں سامنے لائیے۔ ہم قارئین کی سہولت کے لئے انہیں پھر دہرا دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ ہے کہ سوال یہ ہے کہ ـــــ آدمی کی فطرت اتنی قاتلانہ کیوں ہے۔ وہ اتنا خونخوار اور خونریز کیوں ہے جبکہ

لاکھ برس کے تہذیبی تجربوں اور تعلیم و تفکر اور فلسفہ طرازیوں اور جمالیاتی ارتقاء کے باوجود آج بھی اپنے قابیلی کردار سے نجات نہیں پا سکا۔

ایک بات جو انہیں پریشان کر رہی ہے ——— یہ ہے کہ ہماری تاریخ ساری لہولہان کیوں ہے۔ ہمارا سارا سرمایۂ ملی آخر زخم ہی زخم کیوں ہے، ہماری ساری کمائی لاشوں اور میتوں کی شکل میں کیوں ہے؟

یہ سوال بڑا اہم ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ اسے ابلہ فریبی کہیں یا تجاہل عارفانہ، کہ جس سوال کا جواب سوال کرتے وقت خود صدیقی صاحب کے سامنے پڑا تھا، وہ انہیں نظر کیوں نہ آیا اور انہیں اس کے جواب کے لئے اوروں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ ہم صدیقی صاحب سے گزارش کریں گے کہ وہ (اپنے اس سوال کے جواب کے لئے) خود اپنی جماعت (اسلامی) کے امیر، سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب کی کتاب ——— مرتد کی سزا ——— کھولیں۔ اس میں صفحات ۷۹ ـ ۸۰ پر انہیں یہ عبارت ملے گی۔

اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جائے اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب لوگوں کو بزورِ اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں، تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہیگا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں مسلمان سمجھا جائیگا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائینگے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائیگا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کیجائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے

مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں"

ظاہر ہے کہ "اسلام" کے معنی ہونگے وہ طریقہ جسے یہ حضرات "اسلام" قرار دیں۔

نعیم صاحب! بات صرف اتنی ہے کہ جب طاقت دوسرے کے ہاتھ میں ہو، اور اس کا وار آپ پر پڑے، تو وہ یکسر ظالم، مستبد اور خونخوار قرار پاتا ہے۔ اور جب وہی طاقت آپ کے ہاتھ میں آجائے اور وار دوسرے پر پڑے تو پھر آپ حق و صداقت کے علمبردار ہوتے ہیں، اور فریقِ مخالف مستحقِ دار و رسن! آپ کو حضرت علیؓ کے زمانے کے "اجارہ دارانِ مذہب" تو یاد آگئے، لیکن خود اپنے دور کے اجارہ دارانِ مذہب (یعنی اپنی جماعت) کی طرف نگاہ نہ اٹھی! آپ خدا اس سوال کا جواب دیجئے کہ جب، آپ کے امیر جماعت کے تجویز کردہ "ایک سال کے نوٹس" کے بعد، آپ عملِ تطہیر شروع کریں گے اور ان لوگوں کو قتل کرنے کے لئے تلوار لے کر اٹھیں گے جو آپ کے ہمنوا نہیں ہوں گے تو کیا آپ اُس وقت کسی حسن البنا، کسی عبدالقادر عودہ اور کسی سید قطب کی اس بنا پر جان بخشی کر دینگے کہ وہ قرآن کے جلیل القدر مفسر اور (اپنے مسلک اور عقیدہ کے مطابق) دین کے بہت بڑے خادم تھے؟ اس سوال کے جواب میں جو کچھ آپ فرمائیں گے، وہی آپ کے موجودہ سوال کا جواب ہوگا۔ آج خنجر کفِ قاتل میں ہے اور وہ آپ کی نگاہ میں ظلم و ستم کا مجسمہ ہے۔ اُس وقت خنجر آپ کے ہاتھ میں ہوگا لیکن آپ اپنے آپ کو حق کے علمبردار سمجھیں گے۔ (واضح رہے کہ ہم اس وقت مصر کے حادثہ پر محاکمہ نہیں کر رہے، بلکہ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ آج جس خونریزی پر آپ خود بھی خون کے آنسو رو رہے ہیں اور اوروں کو بھی رُلا رہے ہیں، کل کو اگر اقتدار آپ کے ہاتھ میں آیا تو اسی خونریزی کے سب سے بڑے کردار آپ خود ہوں گے۔ آج ناصر کے نقطۂ نگاہ سے "عملِ تطہیر" ہو رہا ہے، اس وقت "عملِ تطہیر" آپ کے نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔)

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ——

> قرونِ اولیٰ کے سوا ہماری تاریخ میں جبریت کا سکہ کیوں چلا آرہا ہے اور آج بھی دیس دیس میں چل رہا ہے .... آپ کا مذہبی تصور کچھ ہی ہوا کرے ..... آپ تعلیم و استدلال کے راستے پر ثابت قدمی سے کیوں نہیں چلتے۔ ساری دنیا میں اور سارے عالم میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ کہیں فوجی طاقت کے ذریعے، کہیں بیرونی امداد کے بل پر، کہیں مغالطہ انگیز پراپیگنڈے کے زور سے، کہیں خفیہ سازشوں کے راستے سے، کہیں مسلح بغاوت کے ذریعے سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہیں اور پھر جبر کی تلوار سونت لیتے ہیں۔

سوال بڑا اہم ہے کہ لوگ تعلیم و استدلال کے راستے پر گامزن رہنے کے بجائے، مسلح طاقت کے زور پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب بھی مودودی صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ (اسلامی ریاست صفحہ ۲۱۴ پر) لکھتے ہیں۔

> جب صالحین کا گروہ منظم ہو۔ اہل ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو۔ یا کم از کم اس کا ظن غالب ہو، کہ عملی جد و جہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی، اور کسی بڑی تباہی و خونریزی کے بغیر مفسدین کے اقتدار کو ہٹا کر صالحین کا اقتدار قائم کیا جا سکے گا، اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کر کے ملک کے اندر بزور شمشیر انقلاب پیدا کریں اور حکومت پر قبضہ کریں۔

نعیم صاحب! مل گیا آپ کو جواب اپنے سوال کا؟ باقی رہا یہ کہ اس طرح اقتدار حاصل کر لینے کے بعد، جبر کی تلوار کیوں سونت لی جاتی ہے، تو اس کا جواب بھی اپنے امیر ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس طرح حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جس قسم کا سٹیٹ قائم کریں گے:

> وہ اسٹیٹ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اسٹیٹ ہے اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ، اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی)

کیا دنیا میں جبر کی اس سے بڑی تلوار کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

صدیقی صاحب نے ایک سوال یہ بھی کیا ہے کہ .... ہم لوگ اپنے اختلافات کو محبت بھرا، دلچسپ اور پیارا پیارا کھیل کیوں نہیں بنا سکتے۔ آخر افہام و تفہیم کے بجائے غیظ و غضب کیوں؟ بحث و نظر کے بجائے مجادلہ و مناظرہ کیوں؟ دلیل کے بجائے گالی کیوں؟

کتنا پیارا ہے یہ وعظ ...! اس کے جواب کے لئے حسب ذیل چند الفاظ پر نگاہ ڈالئے۔

۱ فساق اور فجار، اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع دنیا کے امام و پیشوا اور

منتظم رہیں اور پھر دنیا میں ظلم و فساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو؟
یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔

چند ایک اور بھی —

ص۲ جاہل، بہتان طراز، مفتری، اخلاقی تعلیم سے بے بہرہ، تقویٰ، تقدس، للّٰہیت اور تقرب الی اللہ کا ڈھونگ رچانے والے، فریبی، جھوٹے، مذلوبی حرکتیں کرنے والے — علم واخلاق سے بے تعلق، فاسد ذہنیت کے مالک، پیشہ ور دیندار، عقل کے اندھے، خدا اور مخلوق کی شرم سے بے بہرہ، بے حیا، بیوقوف، فریبی، دجل و کذب کے مالک، کفن چور۔ وغیرہ

اور صرف دو اور

ص۳ یہ لوگ نامراد ہیں، بے حیا ہیں، ان لوگوں کی باتوں کا جواب دینا ہماری توہین ہے۔

نعیم صاحب! آپ پہچانتے ہیں کہ یہ بولی کن کی ہے، اور یہ الفاظ کس کے قلم و زبان سے نکلے ہیں۔ آپ بھول گئے ہوں تو ہم یاد دلا دیں۔ کہ ص۱ خود آنجناب کے ارشاداتِ گرامی ہیں جو آپ نے (جولائی ۱۹۴۹ء کے ترجمان القرآن کے اشارات میں) پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی شان میں رقم فرمائے تھے۔ ص۲ مدیرِ ایشیا نصر اللہ خان عزیز کے ہیں جو انہوں نے لاہور کے ایک جلیل القدر عالم کے متعلق (جو اب رحلت فرما چکے ہیں) ان کے اس جرم کی پاداش میں ارشاد فرمائے تھے کہ وہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ اور ص۳ خود آپکے امیر (مودودی صاحب) کے گلہائے تقدس ہیں جو اس وقت برگ افشاں ہوتے تھے جب ان سے کہا گیا تھا کہ آپ اپنے معترضین کے عاید کردہ الزامات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء)

نعیم صاحب نے فرمایا ہے:۔

میں نے ایک ایسا خاندان بھی دیکھا ہے جس میں بیک وقت ایک صاحب کانگریس کے لیڈر تھے، دوسرے مسلم لیگ کے، تیسرے کمیونسٹ تھے، اور چوتھے کچھ اور — اور یہ سب لوگ یکجا تھے۔ اچھی طرح ملتے جلتے تھے، ہنستے بولتے تھے، انہوں نے کبھی ایک دوسرے کا گریبان نہیں نوچا، کبھی ہاتھا پائی نہیں کی، کبھی ایک دوسرے کو ختم کرنے کی تدبیریں نہیں سوچیں۔

ہمیں غیب کا علم تو نہیں، لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس خاندان کا آپ نے ذکر فرمایا

ہے اس میں اور سب ہوں گے لیکن کوئی "مذہبی اجارہ دار" نہیں ہوگا۔ اگر ان میں ایک بھی مذہبی اجارہ دار ہوتا تو اس خاندان کی ایسی حالت کبھی نہ رہ سکتی۔ اس لئے کہ (مودودی صاحب کے الفاظ میں)

> اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کے زخمی کئے بغیر وہ بات نہیں کر سکتا۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم)

اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے الفاظ میں۔

> فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہزنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں ہمارے عزیز بھائی! آپ کے "سوال در سوال" کے جوابات، جو خود آپ کے اپنے ہاں موجود تھے۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ آنکھ اپنے آپ کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ صرف دوسروں کو دیکھ سکتی ہے۔ دنیا میں مستبد حکمرانوں نے جس قدر مظالم کئے ہیں انہیں کون قابلِ مذمت قرار نہیں دیتا۔ لیکن آپ نے تاریخ کی جس خونچکاں داستان کا رونا رویا ہے، اگر آپ ذرا خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے کسی چنگیز اور ہلاکو کے حصے میں اس قدر خون ریزی اور فساد انگیزی نہیں آئی جس قدر "مذہب کے اجارہ داروں" کے ہاتھ سے ظہور میں آئی ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جب قوت مخالفین کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو وہ ظالم اور بیداد گر ٹھیرائے جاتے ہیں اور یہ خود بڑے مظلوم اور مقہور بنتے ہیں۔ لیکن جب یہی قوت ان کے اپنے ہاتھ میں آ جاتی ہے تو یہ اپنے گوسفندی لبادے کو اتار کر، اپنے مخالفین کے ساتھ وہ کچھ کرتے ہیں جس سے انسانیت کا دل دہل جائے۔ لیکن اسے ظلم و استبداد نہیں، حق و صداقت کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ آج آپ جو مصر کے حادثہ پر خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ کل کو اگر (خدانکردہ۔ خدانکردہ) قوت آپ کے ہاتھ میں آ گئی تو، ایک سال کے نوٹس کے بعد" جب آپ کی طرف سے عملِ تطہیر شروع ہوگا تو آپ اپنی تلوار کی ہر ضرب پر اپنے آپ کو اقامتِ دین کا سب سے بڑا مجاہد تصور کریں گے۔ لہٰذا آپ لوگ کس منہ سے واویلا مچاتے اور عدل و انصاف کے نام پر انسانیت سے اپیل کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ آپ کی تو

> زباں کچھ اور، بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

آپکی یہ مسکینی و فروتنی۔ آپکے یہ درد بھرے نالے۔ آپکے یہ آنسو اور خون رلا دینے والے نوحے، صرف اسوقت تک ہیں جبتک تلوار آپکے ہاتھ میں نہیں آتی۔

مذاہبِ عالم کی

آسمانی کتابوں کی کہانی

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ خدا کی تعلیم دنیا کی ہر قوم کی طرف آئی لیکن کسی قوم کے پاس بھی اس کی آسمانی کتاب اپنی شکلِ اصلی میں موجود نہیں۔ یہ دعویٰ بہت بڑا ہے اور (ظاہر ہے کہ) جب تک اسے مستند دلائل سے ثابت نہ کیا جائے، کسی مذہب کے حامل بھی اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ پرویز صاحب نے اس عظیم ذمہ داری کو اپنے سر لیا اور ایک مدت کی محنتِ شاقہ کے بعد، ان تمام کتابوں کی سوانح عمری مرتب کر دی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کیسے مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور اب ان کی کیفیت کیا ہے۔ ان کی یہ تحقیقِ جلیل پہلے، ان کی مایۂ ناز تصنیف "معراجِ انسانیت" میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ کتاب اس وقت نایاب ہے، اس لئے اسے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد، الگ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل مذاہب کی کتابوں کی سرگذشت ہے۔

(۱) یہودیت۔
(۲) عیسائیت۔
(۳) مجوسیت۔
(۴) ہندومت۔ (اس میں وید۔ پران۔ گیتا۔ شاستر۔ سمرتی۔ رامائن۔ مہابھارت سب شامل ہیں)
(۵) بدھ مت
(۶) جین مت
(۷) (اہلِ چین کے قدیم مذاہب) کنفیوشس ازم اور طاؤ ازم۔
(۸) (اہلِ جاپان کا قدیم مذہب) شنٹو ازم۔

آخر میں ایک مبسوط مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم، حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں ایک شوشہ کی بھی کمی بیش نہیں ہوئی۔

کتاب پریس میں جا چکی ہے۔ لیکن آپ اپنی فرمائشیں جلد بھیجدیں کیونکہ اس کی مانگ بہت زیادہ ہوگی اور کتابیں فرمائشوں کی ترتیب کے مطابق بھیجی جائینگی۔ قیمت کا اعلان اگلے پرچے میں کیا جا سکے گا۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

(بقیہ صفحہ ۹ سے)

صوبوں میں گورنر، دیگر بستیوں میں نمائندگانِ حکومت (اولوالامر) اور فوج میں کمانڈر، امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اسلام اس تصور سے ناآشنا (بلکہ اسے مٹانے کے لئے آیا) تھا کہ فوج کی کمان اوفیسر کمانڈنگ کرے، اور امام مولوی صاحب ہوں۔" دین اور دنیا" کی یہ تفریق، بعد کی پیداوار ہے جب اسلام کی گاڑی اپنی پٹڑی چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تھی۔

ہم پاک فضائیہ کے اربابِ حل و عقد سے گزارش کریں گے کہ انہوں نے جو نہایت مبارک اقدام کیا ہے، اسے محض تلاوتِ قرآنِ مجید تک محدود نہ رکھیں، بلکہ ایسا انتظام کریں کہ عام نمازوں کی امامت، اور جمعہ اور عیدین کی خطابت کے فرائض بھی افسر ہی سرانجام دیں۔ اس کے لئے، افسران کی ٹریننگ کے نصاب میں ایک مختصر سا کتابچہ شامل کر دیا جائے جس میں امامت و خطابت سے متعلق ضروری ہدایات درج ہوں۔ اگر انہوں نے اس کی ابتدا کر دی تو بری اور بحری فوج میں بھی یہ سلسلہ چل پڑے گا اور اس کے بعد، ہو سکتا ہے کہ سول میں بھی یہی روش اختیار کر لی جائے۔ یہ انداز صحیح اسلام کی طرف پلٹنے کے لئے ایک نہایت عمدہ اقدام ہوگا جس کے نتائج بڑے دور رس ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا سہرا پاک فضائیہ کے سر ہوگا۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور۔ ۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۸ بجے۔

کراچی۔ سندھ اسمبلی ہال، بندر روڈ۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے

لائلپور۔ پنجاب بیریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پیپلز کالونی۔ ہر جمعہ کی شب۔ بعد نماز مغرب۔

لیہ۔ مغل ہوٹل، نزد ریلوے سٹیشن ہر جمعہ کو بعد نمازِ جمعہ۔

ملتان۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک دروازہ۔ ہر جمعہ۔ بعد نماز مغرب۔

سرگودھا۔ ۲۷ سٹلائیٹ ٹاؤن۔ ہر اتوار ۵½ بجے شام

راولپنڈی۔ الکوثر بلڈنگ۔ متصل زنانہ کالج۔ مری روڈ۔ ہر جمعہ۔ شام ۵ بجے۔

سید حسن۔ سید محمد حسین شاہ صاحب، نمائندہ بزم سے وقت اور مقام دریافت کر لیا جائے۔

انگلستان میں، یہ درس بزمِ طلوعِ اسلام بریڈفورڈ کے زیرِ اہتمام نشر ہوتا ہے۔

رشتہ کی ضرورت

میرا بڑا لڑکا جو سلیم الطبع ہے اور قرآنی فکر سے دلچسپی رکھتا ہے تعلیم میٹرک اور الیکٹریشن کورس پاس شدہ ہے۔ اسوقت ۹۰/- روپے ماہوار پر ملازم ہے۔ عمر ۲۱ سال ہے۔ اس کیلئے موزوں رشتہ کا طلبگار ہوں ــ خط و کتابت کا پتہ:-

قریشی معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

خدا ___ اور ___ سرمایہ دار

(پرویز) ___

"اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں" ___ یہ ایک قدیم مسلمہ ہے اور حقائق فہمی کے لئے عمدہ اور مؤثر طریق ۔ قرآنِ کریم نے بھی بسا حقائق کو سمجھانے کے لئے اس طریق سے کام لیا ہے۔ یعنی وہ دو متضاد اشیاء کو آمنے سامنے رکھ کر حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۔ یاد رکھو! اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، تاریکی اور روشنی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، سایہ اور دھوپ یکساں نہیں ہو سکتے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۔ (۳۵/۱۹-۲۱) اور مردہ اور زندہ بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے: یعنی اگر آپ نے یہ سمجھنا ہو کہ زندہ کسے کہتے ہیں تو ایک مردہ پر غور کرو۔ جو جو بات' مردہ میں نہیں ہوگی، جس میں وہ باتیں ہوں گی وہ زندہ ہوگا۔ یہی طریقہ اس نے دین کی حقیقت و ماہیت سمجھانے کے لئے اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ دیکھنا ہو کہ دین کا پیغام اور اس کا نظام زندگی کیا ہے، تو اس پر غور کرو کہ دین کی مخالفت کس کس طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ جس طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت کی گئی تھی، دین اس نظام کی ضد تھا جس کا علمبردار وہ طبقہ تھا۔ اس اہم مطالعہ کے لئے اس نے ہمیں انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کا محتاج نہیں رہنے دیا۔ قرآن کریم نے دین کی تاریخ خود ہی محفوظ کر کے ہم تک پہنچا دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کے رسول' انسانوں تک دین پہنچاتے رہے۔ اس سلسلہ کا آغاز اس نے حضرت نوحؑ سے کیا ہے اور خاتمہ' حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ___ وہ بتاتا ہے کہ دین اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے ___ دین کے معنی ہیں انسانوں کے لئے نظامِ زندگی ___ اور اس کی مخالفت بھی، شروع سے آخر تک' ایک ہی قسم کے طبقات کی

طرف سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی اربابِ حکومت، جو اپنی مرضی دوسروں پر چلانا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار، جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی اور تعیش کی زندگی بسر کرتے تھے اور مذہبی پیشوائیت، جو خدا کے نمائندے بن کر، اول الذکر دونوں گروہوں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول آیا تو ان تینوں گروہوں نے اس کے پیش کردہ دین کی مخالفت کی۔ لہٰذا، اگر آج بھی یہ دیکھنا ہو کہ خدا کا تجویز کردہ نظامِ حیات (دین) کیا ہے، تو "تعارف بالضد" کے اصول کے مطابق، اس کا معیار یہ ہے کہ جس نظریہ کی مخالفت ان گروہوں کی طرف سے ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ دین کے مطابق ہے۔ اور جس کی تائید ان کی طرف سے ہو، وہ دین کے خلاف ــــ یہ نہایت واضح، روشن، اور بیّن اصول ہے۔ اور نہایت آسان اور سادہ طریقِ کار، جس کی تائید خود قرآنِ کریم کرتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان تھا ــــ دین کے دشمن ــــ مجملاً بتایا تھا کہ ان تینوں گروہوں کی طرف سے دین کی مخالفت کس کس انداز سے ہوتی رہی۔ صحبتِ امروز میں، ذرا وضاحت سے بتایا جائے گا کہ ان میں سے ایک گروہ ــــ یعنے سرمایہ داروں ــــ نے کس طرح ہر رسول کی مخالفت کی، اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ نظام متشکل نہ ہونے پائے جس کے داعی انبیاء کرامؑ تھے۔

"سرمایہ داروں" کے لئے قرآن کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آتی ہیں۔

(۱) اَلْمَلَأُ ــ مَلَأَ ــ یَمْلَأُ ــ مَلْأٌ کے بنیادی معنے ہیں، کسی چیز کو بھر دینا۔ اِس اعتبار سے اَلْمَلَأُ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ غیر خداوندی نظام میں عزت اور ریاست کا معیار، دولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے۔ اس لئے تبعاً، یہ لفظ (اَلْمَلَأُ) سردارانِ قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِیْنَ ــــ وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گذار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو۔ اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآنِ کریم نے مُتْرَفِیْنَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔ (۳۴/۳۵) جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثرت سے دولت ہے۔ اور ہمارا قبیلہ اور جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے کریں ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔؟

حضرتِ نوحؑ

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعیِ اول حضرتِ نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اس نے اُن سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو) مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ (۵۹/۷)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟ — سنیئے!

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۷/۶۰)

اس قوم کے دولت مند سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پر چلنے سے اسقدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسی سے ہم پر تباہی آجائے گی۔)

سورۂ ھُوْدؑ میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ جہاں کہا ہے کہ۔

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ (اس لئے ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو — لہٰذا ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱/۲۷)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اور دولت مند اور طاقت ور طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولت مند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم

تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پر حضرت نوحؑ نے کہا:۔

تم اس پر غور کرو کہ میں جو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اسکے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کروں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو ـــــ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بیشک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ ..... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل و حقیر ہیں۔ اور انہیں اس کے ہاں سے کوئی خوشگواری کا سامان نہیں مل سکتا، یہ غلط ہے قانونِ خداوندی کی رُو سے معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے جوہرِ ذاتی ہیں۔ اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۱/۲۹-۳۱)

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی، جو ہر ایسا شخص جو دولت و قوت کے نشہ میں بدمست ہو، دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"اے نوحؑ! ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لے آؤ ـــ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔" (۱۱/۳۲)

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امراء قوم نے کہا کہ

اے نوحؑ! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنا لیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟) (۲۶/۱۱۱)

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کرتے ہیں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیق کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

سورۃ 'المؤمنون' میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے، اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اسکا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا کہ امیر اور غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳/۲۴)

لیکن، آخر الامر ہوا یہ کہ انہی ناداروں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی، اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدمست ہو رہے تھے، غرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد، قرآنِ کریم کہتا ہے کہ :۔

> اس سرگزشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں ــــ (۲۳/۳۰)

حضرت ھُودؑ

قومِ نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قومِ عاد کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ھُودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفریں نظامِ زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اسکے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ..... اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کہا کہ

> ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جا رہی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ (۷/۶۶) نیز (۲۳/۳۳)

اس قوم کو رزق کی کسقدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا تھا، اس کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے کہ

> حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اِس وقت سامانِ زیست کس قدر فراواں حاصل ہے۔ مال مویشی کی کثرت، افرادِ قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، اُن کی سیرابی کے لئے رواں دواں چشمے۔ (یہ سب خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے میموریل بناتے ہو جنکا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے بھلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۶/۱۲۸-۱۳۵)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا تھا، قرآن بتاتا ہے کہ

> (انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا نہ کرنا یکساں ہے (خدا، اور اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ یہ سب) اگلے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ (۲۶/۱۳۶-۱۳۹)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس

> سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں، اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب، ان کے کسی کام نہ آیا۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۴۶/۲۶)

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ "اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جن کا نظام، تمہارے نظام کی ضد ہوگا" (۱۱/۵۷)۔ یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رُو سے وہ قوم جو غلط نظامِ حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

حضرت صالحؑ

قوم عاد کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ دعوتِ انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زمانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشی تھے۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالا دست طبقہ نے ان ذرائع پرورش کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلانِ انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ

یٰصٰلِحُ ۔ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ۔ (۱۱/۶۲)

اے صالحؑ! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری امیدوں کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ ۔ (۷/۷۵) اس کی قوم کا وہ دولت مند طبقہ جس نے دھاندلی مچا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگڑ بیٹھے تھے؟ — انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر تمکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیش نظر رکھو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۷/۷۴)

پھر انہوں نے کہا کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اسقدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ـــ ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں۔ ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تہ بہ تہ لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نما محلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اتراتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا ـــ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علیٰ حالہٖ قائم رہینگی؟ (۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنے انہوں نے حضرت ھودؑ سے تو کچھ نہ کہا، کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریبوں، اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔

اس پر اُس قوم کے سرکش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا جماعت مومنین سے کہا ـــ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے ـــ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسے ایسا تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہو گا)۔ (۷/۷۵-۷۶)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا۔ تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگاہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا۔ کہ مجھے اس کا عملی ثبوت ملنا چاہیئے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچکر ـــ یہ میری اور یہ تیری ـــ کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور پھر "میری زمین میں میرے مویشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے" حالانکہ نہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے مویشیوں کی تفریق ـــ یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں

سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری — اور اسے میں چراگاہ میں چھوڑتا ہوں جو نہ میری ہے نہ تیری۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ — تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۱۱/۶۴)

یہ خدا کی اونٹنی ہے، جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند رہو گے۔ لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

قرآنی نظام کی اساس

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس طرح چار لفظوں میں سمیٹا کر رکھ دیا ہے — هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ — تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ — خدا کی زمین مخلوقِ خدا کی پرورش کے لئے — قرآن کریم میں جس چیز کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے (یعنے یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہے) اس سے مراد یہی ہے کہ وہ عام انسانیت کے لئے کھلی ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ مثلاً اس نے کعبہ کو بیت اللہ (یا بیتی — میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے تو اس کی تشریح خود ہی یہ کہہ کر کر دی کہ — بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ — (۳/۹۵) وہ گھر جسے تمام نوعِ انسان کے لئے بنایا گیا ہے — مَثَابَةً لِّلنَّاسِ — (۲/۱۲۵) عالمگیر انسانیت کا اجتماعی مرکز — قِیٰمًا لِّلنَّاسِ — (۵/۹۷) تمام نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ۔ (۲۲/۲۵) جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے — خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ہوں — یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ اسی طرح جب اس نے ارض اللہ کہا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوعِ انسان (بلکہ ساری مخلوق کے لئے) ذریعۂ پرورش ہے۔ معاشرہ کو ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ خدا کے رزق سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ "خدا کی مخلوق اور خدا کی زمین" یہ ہے دین کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد جس کا اعلان حضرت صالحؑ نے کیا۔

قوم کے سرمایہ داروں نے ماننے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب برابر کر دیئے گئے ہیں تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی — فَعَقَرُوْهَا (۲۶/۱۵۶) انہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (نیز ۵۴/۲۹، ۹۱/۱۴) اور

اپنے اسی سابقہ معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا (۹۱/۱۴) خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا۔ اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کرکے رکھ دیا۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

قومِ مدین

اسی طرح قومِ مدین کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی تھی اور کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسٰےؑ کے اس واقعہ سے لگائیے جو اس بستی سے باہر پیاؤ پر پیش آیا۔

حضرت موسٰےؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب، درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو پیاؤ سے دور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسٰیؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی طرف جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

> جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحبِ قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی آدمی نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے (۲۸/۲۳)

حضرت موسٰیؑ نے دل میں کہا کہ ـــ بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست ـــ مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونیوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمہ کے قریب نہیں آنے دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸/۲۴) کہ

خدا وندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ

تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظام خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دیکر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔

(۷/۸۵-۸۶) و (۲۶/۱۸۱-۱۸۴)

شروع شروع میں انہوں نے، حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا کہ — اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۲۶/۱۸۵)، ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر، کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا کہ یہ ایک "مذہبی ریفارمر" ہے۔ اسلئے اسے جس طرح یہ چاہتا ہے، اسی طریق پر صلوٰۃ (پوجا پاٹ) ادا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے چنانچہ انہوں نے کہدیا کہ ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک "صلوٰۃ" سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)

(تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لیکر آئے ہو اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں

دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں) کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے
کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آرہے ہیں
اور نہ ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور نہ جس طرح ہمارا جی چاہے
اسے خرچ کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے ــــ یہ کوئی انوکھی
صلوٰۃ ہے!

(ضمناً آپ نے غور فرمایا کہ' مذہب' میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور 'دین' میں
صلوٰۃ کا مقصود کیا؟ دین کی رُو سے صلوٰۃ کا نظام' قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر
لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہرحال' جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے
دھمکیاں دینی شروع کیں ــــ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ ۔

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے' جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے کہا
کہ اے شعیبؑ! دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہو گی ــــ یا تو تمہیں اور تمہارے
ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم مسلک اختیار کرنا ہو گا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ
ہو لئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب
تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ (۸۸)

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی ۔ (۷/۹۱)

صاحبِ ضربِ کلیم

اور داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم' حضرت موسٰیؑ تو ہے ہی ــــ ملوکیت ، مذہبی پیشوائیت ،
اور نظامِ سرمایہ داری تینوں کے خلاف ۔ بیک وقت دعوتِ مبارزت ۔ فرعون ، ملوکیت کے استبداد
کا مجسمہ ــــ ہامان ، مذہبی پیشوائیت کی روباہ بازیوں کا نمائندہ ــــ اور قارون' نظامِ سرمایہ داری
کی ہوسِ خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے' اس نے بھی اپنی مملکت کے استحکام
کے لئے قوم کو معیشت کے نام پر ہی اپیل کیا تھا جب کہا تھا کہ

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں اور
جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے' میری نہیں ؟ (۴۳/۵۱)

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعی انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر نہروں کا پانی بند کر دیا جائے گا"

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے تصادم کی داستان الگ ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظام سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتدا ہی بڑے رمز آفریں انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ — اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۔ (۲۸/۷۶) — فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا جس نے بنی اسرائیل کو اپنی حکومت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ لیکن قارون خود قوم موسیٰ کا فرد تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ اور کسی بدترین غدار کے علاوہ، کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر، دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ۔

ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے، اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیش نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کر و فر اور شان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ (۲۸/۷۹)

جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسروں کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دور اور ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے۔ وہ کہتا ۔ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۔ (۲۸/۷۸) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کا کیا حق ہے اور اس کی بابت مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے؟

یہ کشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد۔

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اس وقت کوئی گروہ

> ایسا نہ نکلا جو قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ہی ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔ (سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زمانے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔ (۲۸/۸۱)

عدلِ داؤدیؑ

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں :-

> مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانویں دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی، جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے، مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دیدے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر بھی۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں ــــ یہ ہے میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ اب بتاؤ کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۸/۲۳)

یہ تھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ سے کہہ دیا گیا کہ

> (تم بلا خوف و خطر، اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو۔) ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔ (۳۸/۲۶)

حضرتِ عیسٰےؑ

مسیحِ انسانیت، حضرت عیسٰےؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چیلنج، اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سامنے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسٰےؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح، سرمایہ پرست یہودی ہیکل کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو آپ کے سامنے لے آتے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد، ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی، اس کے متعلق انجیل برنباس کا ایک اقتباس دیدینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے، کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے۔ کیوں کہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت جہاں بھی ہو اس کا مسئلہ مذہبی نہیں ہوتا، معاشی ہوتا ہے۔ اور چونکہ دینِ خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو کوئی تعمیری کام کئے بغیر، دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائے، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ ہیکل کے احبار و رہبان، حضرت عیسٰےؑ کی اس انقلاب آفریں دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

آخری دور

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوعِ انسانی کو دیا گیا تو نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گئی ہمارے ہاں کے مروجہ اسلام کی رُو سے، جو ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیرداری کا وضع کردہ اور مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم ہے، نبی اکرمؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عربوں میں شراب خواری، جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، تو ہمانہ رسومات عام تھیں۔

حضورؐ ان قبیح رسومات کی اصلاح کے لئے تشریف لاتے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپ ایسے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریشِ مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جو عام اخلاقی اصولوں کی رو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان کے معبودوں کو گالی مت دیں۔ لہٰذا ان کے اندازِ تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بت پرست ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس سوال کا جواب ہمارا مروجہ مذہبی طبقہ نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب البتہ ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔

• حضورؐ کی دعوت کیا تھی؟

بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو چیانگ کائی شک کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر خفت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہلِ امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کائی شک اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی (یا خود اپنی سیاست کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ ور چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ تاریخ کے اس تحیّر انگیز واقعہ (یعنی انقلاب چین) کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے

> نہ تو حکومتِ امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی

ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں
تاکہ وہ اہلِ چین کے درد آگیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد، بیلڈن اس انقلاب عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام لوگوں کو جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ۔

كَلَّا ۔ بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۔ وَلَا تَحٰٓضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۔ (۱۷/۸۹)

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس کی روٹی مہیا کرنے کی تلقین نہیں کرتے تھے جس کی چلتی گاڑی رُک جائے۔

یہ تھا آپ کا وہ انقلاب آفریں پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپ، ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں۔)

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۔ (۱۰۶/۲)

ان کے کاروانِ تجارت سردی، گرمی، سارا سال۔ رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعیٔ انقلابؐ کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی اس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابوجہل نے، جب غلافِ کعبہ کو تھام کر اس تحریکِ جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی ہے تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدک[1] لایا تھا۔ محمدؐ کو یہ سبق (معاذ اللہ) سلمان پارسیؓ نے پڑھایا ہے۔ ؎

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

---

[1] ایران میں اشتراکیت کا داعی۔

انہوں نے حضورؐ سے مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ـــ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ـ (۷۴/۱۲) اسے بڑی فراواں دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہارے جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں (۹/۷۰) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۵۹/۴۴) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانویں کے پھیر میں پھنس جاتا ہے

تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ (۱۰۴/۱۔۳)

تم "ربِ کعبہ" کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ تمہیں بھوک کا ڈر ستاتا ہے، نہ کسی قسم کا خوف و خطر لاحق ہے۔ تو تمہیں چاہیئے کہ محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرو (۱۰۶)

لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی ہلاکت پر ان کے انجام کی مہرِ تصدیق ثبت ہو گئی تو قرآن کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر ان کی تباہی کے سلسلہ میں کہا کہ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ـ (۱۱۱/۲) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔

"قرآن کا معاشی نظام" سردست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں ـــ ("نظامِ ربوبیت" اس موضوع پر میری مستقل تصنیف ہے۔) قرآن کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ اور جو دین (نظامِ زندگی) وہ پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنوم ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری) میں، سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو۔ اور وہ یہ کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال دولتمند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا

ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۳۴/۳۴)

یعنی اس وقت تک جو بات جزءً جزءً بیان ہو رہی تھی، قرآن کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے، بیان کر کے، دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہدگر متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت بہم پہنچا دی۔ یعنے خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنٰی نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے آباؤ اجداد سے متواتر چلا آرہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور اسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولتمند طبقہ، (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ (۴۳/۲۳)

سورۃ "انبیاء" میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور ناانصافی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں انکے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آگئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون موقعہ تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب اُلٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا اُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جن کی سرشاریاں تمہیں اس قدر مدہوش کئے ہوتے تھیں۔ اور لوٹو ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔ ؟ (۲۱/۱۱-۱۴)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آ جاتے ہیں۔ تو

اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوسِ زراندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ یہ ذہنیت اس قوم پر بُری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روشِ زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۷/۱۶)

سورۃ ھود میں ہے کہ تم اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ۔

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے، ان میں سے بعد میں معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لیجاتے تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے) یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱/۱۱۶)

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے۔ اسلئے کہ غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جس کے لٹنے کا انہیں ڈر ہو۔

حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔرُوْنَ۔

تا آنکہ اس قوم کا مرفہ الحال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور وہ کس بُری طرح سے چیختا چلاتا ہے۔ (۲۳/۶۴)

قولِ فیصل

قرآن کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آچکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دینِ خداوندی کی رُو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو آیئے یہ بھی سن لیجئے جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ۔ (۵۶/۴۵)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد، اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے دیکھ لیا، کہ جو دین (نظام زندگی) خدا کی طرف سے آتا تھا، ہر دور، اور ہر قوم میں سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اس آیۂ جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے قرآنِ کریم نے بطور کلیہ بیان کیا ہے کہ۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا۔ إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ۔ (۳۴/۳۴)

کوئی بستی بھی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنا رسول بھیجا ہو اور اس کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

مذہب اور سرمایہ داری

جب تک وہ دین اپنی شکل میں باقی رہتا، نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی پیش نہ چلتی۔ لیکن اس کے بعد، وہ دوسرا حربہ اختیار کرتے۔ وہ اسی دین کے نام لیواؤں میں سے مفاد پرست گروہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے جو خود اس دین کو مسخ کر کے مذہب کی سطح پر لے آتے اور یہ مذہب، نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بن جاتا یوں سادہ لوح انسان (عوام) خدا کے نام پر اس فریب میں آجاتے۔ جس طرح نظامِ سرمایہ داری دین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، اسی طرح "نظامِ سرمایہ داری" مذہب کی حمایت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ محنت کش طبقہ کو معاشی طور پر کتنا ہی مجبور اور معذور کیوں نہ کر دیا جائے وہ "بطیبِ خاطر" کبھی بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا کہ اس کی محنت کی کمائی کو دوسرے لوٹ کر لے جائیں۔ یہ فریضہ مذہب پرست طبقہ انجام دیتا ہے۔ وہ غریبوں کو یہ کہہ کر افیون پلاتا رہتا ہے کہ یاد رکھو! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے وہ جسے چاہے لاکھوں کروڑوں دے، جسے چاہے فقیر بلنوا کر دے۔ امیروں کی دولت پر حسد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم خدا کی تقسیم کیخلاف احتجاج کرتے ہو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیئے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ مال و دولت، یہ جائیدادیں اور محلات، سب آنی اور فانی ہیں، اصلی زندگی آخرت کی ہے، اور آخرت کی جنت غریبوں کے لئے ہے۔ خود حضور شہنشاہِ دو عالم ﷺ نے اپنے لئے غریبی پسند کی تھی اور الفقر فخری فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ غریبی میرے لئے

باعثِ فخر ہے۔ آپؐ خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہتے تھے کہ مجھے غریبوں میں رکھیو اور غریبوں میں اٹھائیو! اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور غریبوں ہی میں باقی رہے گا ــــ مذہب پرست طبقہ یہ، اور اس قسم کی اور مقدس باتیں دن رات غریبوں اور محنت کشوں کے کان میں ڈالتا رہتا، اور اس طرح انہیں ان کی حالت پر شاکر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یوں نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ مذہب پرست طبقہ خود تو کوئی کمائی کرتا نہیں۔ ان کی اس "خدمتِ جلیلہ" کے معاوضہ میں سرمایہ دار طبقہ، ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لیتا ہے (واضح رہے کہ جو قرآنی آیات اور احادیث اس مقصد کیلئے پیش کی جاتی ہیں انکا مطلب کچھ اور ہے یا انکا مفہوم مسخ کر کے پیش کرتے ہیں)

اسلام کیساتھ کیا ہوا؟

جو کچھ سابقہ انبیائے کرامؑ کے لائے ہوئے دین کے ساتھ ہوا، وہی اسلام کے ساتھ ہوا۔ حضورؐ نبی اکرم نے جس دین کو پیش کیا، سرمایہ دار طبقہ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم، یہ دین اپنی شکلِ عملی میں قائم ہو کر رہا۔ اور اسطرح ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے ابالیس شکست کھا کر، پہاڑوں کے غاروں میں جا چھپے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے وہاں سے پھر سر نکالا، اور اسی سازش کہن کے مطابق جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، مذہبی پیشوائیت، نے اس دین کو خود ساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب بادشاہوں کے لئے مساجد کے منبروں سے ایدہ اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اور سرمایہ داروں کو یہ کہہ کر بدلگام چھوڑ دیا گیا کہ اگر تم بادشاہ کو اس کا ٹیکس، اور ہمیں ہمارا ٹیکس (زکوٰۃ) دے دیا کرو تو پھر تمہیں اجازت ہے کہ جس قدر جی چاہے، دولت جمع کر لو اور جتنی جی چاہے جائیدادیں کھڑی کر لو۔ اس "مذہب" کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور تاریخ کو مسخ کر کے، اور تو اور، خود صحابہ کبارؓ کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی شکل میں دکھا دیا گیا ــــ یہی مذہب، اس وقت تک ہمارے ہاں مروج چلا آرہا ہے جو دین کی ضد ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مروجہ مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ کہیں یہ عظیم الشان مسجدیں بنوا رہے ہیں۔ کہیں ان مساجد کی تزئین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ ملک کے ہزاروں دارالعلوم اور مکتب انہی کے روپے سے چلتے ہیں اور ائمہ مساجد اور علماء کرام کی روزی کے یہی کفیل ہیں۔ مذہب کے نام پر بڑی بڑی جماعتیں انہی کے بل بوتے پر بڑھتی اور پھلتی پھولتی چلی جاتی ہیں فقط یہ ایک بات کہ (سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی حمایت کرتا ہے) اس حقیقت کے اثبات کے لئے دلیلِ محکم ہے کہ یہ اسلام، بہرحال وہ دین نہیں، جو خدا کی طرف سے بوساطتِ محمد رسول اللہ دنیا کو ملا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے۔ کہ

دین جہاں بھی ہوگا، سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سرمایہ دار طبقہ ہمیشہ مروجہ اسلام کی اس قدر حمایت کرتا ہے اور اِس اسلام کے علمبردار اسے اس کی حسنِ خدمت کے عوض جنت کے پروانے عطا کرتے رہتے ہیں۔ مروجہ اسلام کی رُو سے جنت کس قسم کے کاموں کے عوض ملتی ہے؟ تعمیر و تزئین مساجد، اشاعتِ دین کے لئے مالی امداد، صدقات و خیرات۔ زکوٰۃ۔ حج۔ بڑی بڑی درگاہوں کی تعمیر و آرائش۔ نذر نیاز وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ثواب کے یہ کام صرف دولتمند طبقہ ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ غریبوں میں اتنی استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے، اس مذہب کی رُو سے، دنیا بھی سرمایہ داروں کے لئے ہوتی ہے اور آخرت بھی سرمایہ داروں کے لئے یہی ہے وہ ذہنیت جسے نمایاں طور پر سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے سورۂ کہف میں، اپنے تمثیلی انداز میں، دو آدمیوں کا ایک قصہ بیان کیا ہے۔ اس میں، سرمایہ دار کو اس کا دوست سمجھاتا ہے کہ تم ساز و سامانِ حیات کی اس فراوانی پر اتراؤ نہیں۔ اس وقت تو تم بے شک اپنے آپ کو محفوظ و مصئون سمجھتے ہو، لیکن قیامت میں تمہارا انجام کیا ہوگا، کبھی اسے بھی سوچا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ۔

میرے بھائی! تمہاری یہ باتیں محض واہمہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا، کہ قیامت کی گھڑی جس سے تو مجھے ڈراتا ہے، کبھی آئے گی۔ لیکن بفرض محال، اگر ایسا ہوا بھی اور مجھے خدا کے خدا حضور جانا ہی پڑا تو مجھے وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔ (۱۸/۳۶)

"میں نے کئی مسجدیں تعمیر کرائی ہیں۔ ہر مسجد کے عوض مجھے جنت میں ایک مکان ـــ اور وہ بھی یاقوت اور زمرد کا ـــ الاٹ ہو جاتے گا۔ اس کے علاوہ، صدقہ و خیرات کے اکثر کام کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کئی حج کئے ہیں۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ حج کرنے سے انسان ایسے ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ یعنے اس کے تمام سابقہ گناہ دُھل جاتے ہیں۔ میں زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں، اور زکوٰۃ سے باقی مال بالکل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے قیامت میں نجات اور بخشش میرے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ جس کی قسمت میں خدا نے یہاں عیش لکھا ہے وہ وہاں بھی عیش ہی کرے گا!" یہ ہے جنت کی وہ ضمانت جو سرمایہ دار کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ملتی رہتی ہے اور جس کے لئے انہوں نے وضعی روایات کا ایک انبار اپنے ہاں محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

لیکن بِلّٰہ الحمد کہ خدا کی کتاب ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے لہٰذا ان لوگوں کا خود ساختہ مذہب اور اسکی تائید میں وضعی روایات و تفاسیر، قرآن کی اِس شہادت کو کہاں تک چھپا سکیں گی کہ۔

سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہمیشہ دین کی مخالفت ہوگی۔

یعنے دین اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضِد ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کی اس جنت میں باریابی ہو سکے، جو اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہے۔" دینداری کے وہ کام جن کے عوض 'مذہبی پیشوائیت' سرمایہ داروں میں جنت کے پروانے تقسیم کرتی رہتی ہے، دین کی میزان میں ان کا وزن کیا ہوتا ہے، اسے بھی قرآن کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

> کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کے "ثواب" کے کام ـــ مثلاً حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینا، یا خانہ کعبہ کی تزئین و آرائش کا سامان مہیا کر دینا ـــ اُس شخص کے اعمالِ حیات کے برابر ہو جائیں گے جو نظامِ خداوندی کی بنیادی حقیقتوں (خدا اور آخرت) پر ایمان رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے (جسے سبیل اللہ کہا جاتا ہے) مسلسل جدوجہد کرتا ہے؟ اگر تم اپنے ذہن میں ایسا خیال کئے ہو تو کرتے رہو۔ خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ (۹/۱۹)

اس قسم کے "عبادت گزاروں" کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ :-

> ان ریاکار نمازیوں کا انجام تباہی ہے جو اس طرح کی پرستش سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور دین کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایک طرف نمازیں پڑھ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے دیندار ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اس رزق پر جسے پینے پانی کی طرح ہر ایک ضرورت مند کے لئے کھلا رہنا چاہیئے تھا، بند لگا کر اسے اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ (۱۰۷/۱-۷)

ان کا انجام کیا ہوگا؟ ـــ اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا کہ :-

> جو لوگ دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی عام منفعت (فی سبیل اللہ) کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دے۔ جب وہ انقلاب آئے گا تو ان کی اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے ان کی پیشانی، ان کے پہلو، اور ان کی پشت کو داغا جائیگا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم محض اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ گئے تھے اب اپنے سرمایہ کا مزہ چکھو!

خورشید عالم

بھارت کا عالمی کردار — (۲)

بھارت کے عالمی کردار کا مطالعہ اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس کا احاطہ ایک مضمون تو کیا ایک کتاب میں بھی بخوبی نہیں ہو سکتا۔ اس مطالعہ کے لئے کئی دفتر درکار ہیں۔ لیکن اہل پاکستان بالعموم ایسے بے خبر ہو کے سوتے ہیں کہ وہ اس محور کو کم و بیش بھول ہی گئے ہیں جس کے گرد ان کا اپنا عالمی کردار گھومنا چاہیئے۔ چنانچہ دفتر تو رہے ایک طرف چند صفحے بھی ان تقاضوں کے سمجھنے اور ابھارنے پر صرف نہیں کئے گئے جو برصغیر میں مسلمانوں کی بارہ سو سال کی تاریخ نے ان پر عاید کئے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ کہا بھی گیا ہے اس میں بہت کچھ ایسا ہے جسے امانی کا پرتو تو کہا جا سکتا ہے حقیقت پسندی یا ژرف نگاہی سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں۔ مثال کے طور پر، آج کل ہمارے اخبارات اس واویلا کا چرچا کرتے ہیں جو بھارت اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے بڑی ڈھٹائی سے پاکستان کے خلاف کر رہا ہے۔ وہ طفلانہ ناسمجھی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ بھارت پاکستان سے اس قدر خائف ہے کہ اس نے اپنے لئے دنوں کے چین اور راتوں کی نیند کو حرام کر لیا ہے۔ بادنیٰ تعمق بھارت کی عیاری اور اپنی سادگی آشکار ہو جاتی ہے۔ اسی عیاری اور سادگی کو آشکار کرنے کے لئے میں اس موضوع کو پھر اس صحبت میں لے کے بیٹھنے لگا ہوں۔

جیسا کہ ستمبر کے شمارے میں لکھا جا چکا ہے، برہمن نے ورن آشرم کا جال اتنی کے یہ تصور تحت الشعور تک پہنچا دیا تھا کہ سب کچھ برہمن کے استفادے کے لئے پیدا کیا گیا اور ہر کوئی اسی کی خدمت پر مامور ہے۔ اس استفادے اور خدمت کے لئے برہمن کسی قسم کی اخلاقی قیود کا پابند نہیں تھا۔ بلکہ اخلاقی، معاشرتی اور انسانی قدریں اس کی خواہشات کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔ اس نے انسانوں کو اپنے علاوہ کشتری، ویش اور شودر کے طبقات میں تقسیم کیا تاکہ وہ حکومت، سپہ گری، تجارت اور عام خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہیں اور وہ خود بلا روک ٹوک ہر طرح کی خرمستی میں لگا رہے۔ برہمن نے کبھی حکومت کا لالچ نہیں کیا بلکہ حکمرانوں کو اپنا

محافظ اور خادم سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے معاملے میں اس نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا جو بالادست آیا وہ غیر شعوری طور پر اس کا مطیع ہو گیا۔ البتہ اس نے آس یہی لگائی کہ حکمران کی قوت اس کے مفاد کے تحفظ کے کام آتے گی۔ ایسا نہیں ہوا تو اس نے مقابلہ نہیں کیا بلکہ منافقت سے کام لیتے ہوئے اطاعت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب حکمرانوں میں اضمحلال آنے لگے۔ جونہی ایسا وقت آیا، اس نے تلوار سونت لی اور قتل و غارت پر اتر آیا جس چوکھٹ پر وہ ماتھا رگڑتے نہیں تھکتا تھا اسے اکھاڑ پھینکنے میں وہ کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایک چوکھٹ سے فارغ ہوتے ہی وہ دوسری چوکھٹ پر اور زور سے ماتھا رگڑنے لگ جاتا تھا برہمن کے مفاد کا تحفظ ہوا تو، اور نہیں ہوا تو، وہ ہمیشہ تازہ دم آنے والے کے انتظار میں رہا اور اپنی وفاداری کا مرجع بدلنے کے لئے ہمہ وقت تیار۔

حکمرانوں کے قافلوں کے قافلے آئے اور ورن آشرم کے سمندر میں آ کے ڈوبے۔ ان میں سے جو اکا دکا ڈوبنے سے بچے، برہمن کے ہاتھوں ان کے سر قلم ہو گئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ انگریز نمودار ہوا۔ انگریز کا مصرف برہمن کے نزدیک صرف اسی قدر تھا کہ وہ انہیں سابقہ حکمرانوں یعنی مسلمانوں سے نجات دلائے گا۔ ۱۸۵۷ء تک وہ انگریز کے بارے میں متذبذب رہا کیونکہ انگریز اس کے معاملات میں مداخلت کا مرتکب ہوتا رہا۔ اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انگریز اس کے مفاد کا تحفظ کرے گا یا نہیں۔۔۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب اسے بالکل اطمینان ہو گیا کہ نیا حکمران اس کا دشمن نہیں تو وہ پوری طرح انگریز کی پناہ میں چلا گیا۔ نئے حکمرانوں کے جلو میں وطنیت، جمہوریت اور سیاست کے جو یورپی تصورات آئے برہمن نے انہیں حسب عادت، لبیک کر قبول کیا۔ اور ان تصورات کے زور پر انگریز کی طرف سے بے فکر ہو کر بھی، اور اس سے ملی بھگت کر کے بھی وہ مسلمانوں کے درپے تخریب ہو گیا۔ اس کے سامنے آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا، اس لئے نہیں کہ اسے آزادی کا تجربہ نہیں تھا، بلکہ اس لئے کہ اس کی فطرت ثانیہ یہ بن چکی تھی کہ حکمران اس کے مفاد اور اجاروں کے محافظ ہوں اور قدم قدم پر اس کے دست نگر۔۔۔ چنانچہ وہ یہی چاہتا تھا کہ زیر سایہ برطانیہ اس انداز سے زندگی گزارے کہ مسلمان جس کے ہاتھوں اسے بڑی زک پہنچ چکی تھی یا تو بالکل ختم ہو جاتے یا غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے۔ اس مقصد کے لئے یورپ کا تصور وطنیت اس کے کام آیا۔۔۔ اس تصور سے پورا برصغیر۔۔۔ رنگون سے گوادر اور کولمبو سے پشاور تک۔۔۔ اس کا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک قوم اور ایک وطن کے اصول پر ایک وسیع و عریض خطہ ارض پر اس کا تصرف بلا شرکت غیرے ہو جائے گا۔ غیر سے اس کی مراد مسلمان تھا۔ کیونکہ مسلمان نے ہزار سالہ دور حکومت میں ورن آشرم پر کاری ضربیں لگائی تھیں۔ مزید برآں سیاسی غلبے سے محروم ہو کر بھی وہ اپنا تشخص ختم کرنے اور ورن آشرم کی بھول بھلیوں میں کھو جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ برہمن

کسی اور کا تشخص برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔

یہ بات قابلِ فہم ہی نہیں خصوصیت سے اہم ہے کہ کانگریس انگریز کے ایما پر وجود میں آئی اور ہیومؔ کی نظری رہنمائی اور عملی معاونت سے وہ کارفرما ہوئی۔ اسے انڈین نیشنل کانگریس کا نام دیا گیا جس کا مطلب صحیح تر الفاظ میں یہ تھا کہ آج کا بھارت، آج کا پاکستان، آج کا برما اور آج کا سیلون، سب مل کر ایک ملک اور ایک قوم ہیں، اور برہمن کے غیر انسانی شطرنج کے وحشیانہ کھیل، یعنے ورن آشرم کے بے بس مہرے۔

کہنے کو تو یہ بے ضرر اور جائز سیاسی کارروائی تھی لیکن دراصل یہ اعلان تھا دبی زبان سے اس بات کا، کہ برصغیر میں دو ہی فریق ہیں۔ ایک انگریز اور دوسرا ہندو۔ ہندو نے اپنے آپ کو ہندو نہیں کہا۔ وہ "انڈین نیشن" کا لبادہ اوڑھ کے آیا۔ اس کے منہ میں متحدہ قومیت کا "رام" تھا اور بغل میں ورن آشرم کی چھری۔ اس نے میدانِ سیاست میں اپنے آپ کو ہندو نہیں کہا، مردم شماری میں اس نے ہندو کہلانے سے گریز کیا۔ سرکاری ملازمتوں میں "فرقہ وارانہ" تناسب مقرر ہوا تو اس نے اپنے لئے "ہندو" کی بجائے "جنرل" (عام) خانہ پسند کیا۔ اس نے اپنے "..." کا خانہ مخصوص نہیں کرایا۔ بلکہ ہاتھی کا پاؤں بن کر اس نے بہت سے پاؤں اپنے پاؤں کے اندر کر لئے تاکہ جو لوگ ورن آشرم کی خانہ پری سے ابا کرتے ہیں وہ اس نئے جال کے کسی نہ کسی تار میں اُلجھ کر اپنے آپ کو بھول جائیں۔ برہمن جو چال چل رہا تھا وہ موجودہ صدی کے چوتھے عشرے میں بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی۔ جب پنڈت نہرو نے صاف صاف کہہ دیا کہ برصغیر میں دو ہی طاقتیں ہیں۔ ایک انگریز کی اور دوسری کانگریس (یعنے ہندو) کی ۔۔ گویا جو بات ۱۸۸۵ء میں برہمن کے تحت الشعور میں تھی وہ بھارت کے برہمنِ اعظم پنڈت نہرو کی زبان سے ۱۹۳۶ء میں برملا طور پر ادا ہو گئی۔ چنانچہ اُس وقت یہ راز کھلا کہ پچھلی صدی میں جو سیاسی ناٹک رچایا گیا تھا وہ ایک گھناؤنا ڈھونگ تھا۔ وہ برہمن کا تماشہ اور مسلمان کی چِتا تھی۔ اسی طرح مسلمان کے تحت الشعور سے جو بات سرسید کی زبان سے یوں ادا ہوئی کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی تخت پر نہیں بیٹھ سکتے، وہ قائداعظم نے یوں قلندرانہ کہہ دی کہ "میں مسلمان ہوں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، لیکن مسٹر گاندھی ہندو ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتے!" گویا جو ستیزہ گاہ انیسویں صدی میں تھی وہی بیسویں صدی میں بھی رہی، اور اب تک ہے۔ اور جو حریف پنجہ فگن کل تھے، وہی آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے۔

ورن آشرم یورپی اثر کے تحت ہندو مت کہلانے لگا تو ہندو (برہمن) نے قومیت، وطنیت اور حریت کا لبادہ اس عیاری سے اوڑھا، کہ وہ انگریزوں اور دنیا بھر کو یہ دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا کہ برصغیر میں ایک

ہی قوم بستی ہے اور وہ (ہندو نہیں) ہندوستانی ہے۔ انگریز اپنے طور پر دھوکہ کھانے کے لئے تیار بھی تھا۔ تاریخ کے مطالعہ اور اپنے تجربے سے وہ بھانپ گیا تھا کہ "فتنۂ فردا" برہمنیت نہیں اسلام ہے۔ وہ برہمن کی پشت پناہی کر کے بحر عرب کو بحر ہند میں ڈبو دینا چاہتا تھا تاکہ بحر عرب کے کنارے کھڑے ہو کر کوئی کسی اور زمانے کا خواب نہ دیکھ سکے۔ ہندوستانی کہلانے میں بظاہر ہندو کی اپنی نفی ہوتی تھی لیکن دراصل وہ دوسروں یعنی غیر ہندوؤں کی نفی کے درپئے تھا۔ جب پنڈت نہرو کے والد کے نام کی مناسبت سے نہرو کمیٹی کہلانے والی کانگرس کی نامزد جماعت نے اپنی رلورٹ پیش کی تھی تو اس میں صاف طور پر اعتراف کر لیا گیا تھا کہ اکثریت کی فرقہ پرستی قومیت پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظ دیگر ہندوستانی قومیت سے مراد ہندو قومیت ہے۔ اور بیٹا تو باپ سے بھی آگے نکل گیا جب اس نے کہا کہ برصغیر میں دو ہی فریق ہیں ایک کانگریس (یعنی ہندو) اور دوسرا انگریز۔ بہرکیف اپنے آپ پر ہندو نے قومیت کا ملمع اس صفائی سے کیا کہ اصل اور نقل میں تمیز مشکل ہو گئی۔ یہ کھوٹا سکہ اس حد تک کھرا سمجھا گیا کہ مسلمان نے اسے جنس کاسد قرار دیتے ہوئے اس کا چلن گوارا نہ کیا تو حریت کا خالص سکہ جعلی قرار پا گیا۔ انگریز کی آمد کی زد براہ راست مسلمانوں پر پڑی تھی۔ وہ آزادی سے محروم ہو گئے تھے۔ غلامی کا انہیں پہلا تجربہ تھا۔ جس کے لئے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کے تشخص کا تحفظ آزادی میں ممکن تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے جدوجہد آزادی شروع کی۔ اس کی ابتدا مشرقی پاکستان سے ہوئی۔ کیونکہ پہلے پہل انگریز نے وہیں قدم جمائے۔ وہاں ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کیا اور اس کے صلے میں وہ مراتب اور مناصب حاصل کئے جن پر مسلمان فائز تھے۔ مسلمانوں کو قلاش اور بے دست و پا بنانے کے لئے ہندو نے انگریز سے بھرپور سازش کی۔ یہ قطعاً نئی بات نہیں تھی۔ برہمنی ذہنیت یہی گل کھلاتی چلی آ رہی تھی۔ یہ اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ انگریز ۱۸۵۷ء کے بعد آئینی دور شروع نہ کرتا تو ہندو انگریز سے مل کر پوری صفائی سے مسلمان کو نیست و نابود کر دیتا۔ آئینی دور میں تلوار کا بے دریغ استعمال اس کے لئے عملاً ممکن نہ رہا۔ لیکن یہ تلوار پوری طرح نیام میں نہیں گئی۔ "فسادات" کی شکل میں یہ تلوار چلتی ہی رہی اور جب انگریز نے بوریا بستر باندھنا شروع کیا تو پھر سے نیام سے آشنا ہو گئی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتل عام اسی تاریخی پس منظر میں سمجھ میں آ سکتا ہے۔

مسلمان، نہ ہندو کی تلوار سے مرعوب ہوا، اور نہ اس کے سیاسی داؤ پیچ میں آیا۔ لیکن ہندو نے ایسے ہم رنگ زمیں دام پھیلائے کہ خود مسلمان بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کر گئے۔ وہ آزادی کے لئے دیوانہ وار لڑ رہے تھے اور ہندو انگریز سے سازش کر کے ان کو اور ان کی آزادی کی تحریک کو کچل رہا تھا۔ لیکن ہندو نے

ایسی فضا پیدا کر دی کہ سرسید جیسا شخص انگریز کا پٹھو قرار دے دیا گیا۔ سرسید کی سیاسی فراست کا یہ کمال ہے کہ آگ کے شعلوں میں بیٹھ کر اس نے وہ سیاسی منشور تیار کیا جس کے بغیر برصغیر میں نہ سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو سکتا اور نہ وہ مطلوبہ نتائج پیدا کر سکتی۔ برصغیر کے اس بابائے سیاست کو ہندو نے اس طرح بدنام کیا، کہ آج مسلمان آزاد ہو کر بھی وہ سیاہی دھو نہیں سکا جو اس چہرۂ نورانی پر مل دی گئی تھی۔ چنانچہ جنگِ آزادی کی طرح ڈالنے اور اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر نتیجہ خیز بنا دینے کے باوجود آج مسلمان بات کرتا ہے، تو اس کی حد یہ ہوتی ہے کہ جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا بھی حصہ ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے وہ چند مجاہدینِ آزادی کے نام لینے اور ان کی بعض قربانیوں کی تفصیل بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ اور اس طرح کہیں جوتیوں کی صف میں اپنے لئے جگہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ بار بار دہرانے کی ضرورت ہے کہ ہندو کے ذہن میں آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس نے آزادی کی نہ خواہش کی نہ کوشش۔ وہ انگریز سے مل کر اور اس کے زیرِ سایہ رہ کر مسلمانوں کا استیصال چاہتا تھا۔ وہ اسی کے لئے کوشاں رہا۔ اس کے لئے اس نے قتل و غارت سے کام لیا اور طرح طرح کی سیاسی سازشیں کیں۔ اس کا سیاسی کردار انتہائی گھناؤنا ہے لیکن اس نے بڑی صفائی سے اپنا نامۂ اعمال مسلمان کے گلے میں لٹکا دیا اور اپنی تاریخی اور سیاسی سیہ کاریوں کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ چنانچہ مسلمان وہ سب کچھ ہو گیا جو درحقیقت ہندو تھا ــــ انگریز کا خیر خواہ ــ غلامی پسند، ــ وطن دشمن!

آج نگہِ بازگشت ڈال کر جدوجہدِ آزادی میں ہندو کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو چند ایک روشن نقطے اس طرح کے نظر آئیں گے کہ بعض ہندوؤں نے آزادی کے گیت گائے اور اس کے لئے قربانیاں بھی دیں۔ اسے درست مانتے ہوئے بھی ہندو کے سیاسی کردار کے محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ ہندو ذہنیت غیر مفاہمانہ طور پر مسلمان دشمن تھی۔ یہی ہندو کا جذبۂ محرکہ تھا۔ کہیں کہیں دکھائی دینے والی انگریز دشمنی کی جھلک اس کے پرتو سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ہندو، انگریز سے برہم ہوا تو اس اضطرار میں کہ وہ مسلمانوں کے استیصال میں اس کا پوری طرح آلۂ کار نہیں بن سکا۔ وہ آج بھی امریکہ کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیکتا اور ماتھے رگڑتا ہے۔ اس کی قیمت وہ یہ مانگتا ہے کہ پاکستان کو اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے لیکن وہ یہ ہرگز نہیں سوچتا کہ اس کے لئے وہ ملکی آزادی اور قومی غیرت کی کتنی بڑی قیمت دے رہا ہے۔ آزادی اور غیرت، درحقیقت اس کی سرشت میں نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ اس متاع کا خریدار کبھی نہیں رہا۔ اس کا آج کا کردار شاہد ہے کہ اس متاع کا قدردان وہ اب بھی نہیں۔

مسلمانوں کو انگریز کا خیر خواہ اور آزادی ناپسند ثابت کر کے ہندو نے برصغیر میں ہی مسلمان کو بدنام نہیں کیا۔

بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسے غلط رنگ میں پیش کیا۔ عالمِ اسلامی میں اس نے خصوصیت سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ استعمارِ فرنگ کے غلام مسلمان ممالک بڑی آسانی سے اس فریب میں آگئے کہ برصغیر کے مسلمان نہ صرف استعمار کو اپنے ہاں برقرار رکھتے ہیں بلکہ وہ عالمِ اسلام کو استعمار کی گرفت میں رکھنے کے ذمہ دار بھی بن رہے ہیں۔ یہ اس کی بڑی گہری چال تھی، وہ دیکھ رہا تھا کہ مسلمان ملتِ واحدہ ہی نہیں' ان کے علاقے بھی ملحق ہیں۔ وہ اس دُہری وحدت میں رخنہ ڈال رہا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کو استعمار پسند ظاہر کر کے اس نے برصغیر کے مسلمانوں اور ممالکِ مسلمہ میں ایک دیوار حائل کر دی۔ اور آزادی خواہ کا رُوپ دھار کے ممالکِ مسلمہ کا ہمدرد بھی بن گیا اور ان کی ہمدردی کا مستحق بھی۔ دورُخی ہندو کو برہمنیت نے گھٹی میں دی ہے ورن آشرم کی غیر انسانی معاشرتی تقسیم کو برہمن نے اس انداز سے دلوں میں بٹھایا کہ نچلے طبقات یعنی شودر اسے اس حد تک مقدس سمجھنے لگے کہ انہوں نے ہر حال میں اس تقسیم کو برقرار رکھا اور خود اپنے اندر اسی طرح کی تقسیم کی دیواریں کھڑی کر لیں۔ اسی طرح کا دھوکا ہندو نے مسلمانانِ عالم کو دیا۔

جب برصغیر میں تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے اپنی اور ہندو دونوں کی یقینی آزادی کا عملی اور واضح تصور پیش کیا تو آزادی اور اسلام کے دشمن ہندو نے چپکے سے مسلمانانِ عالم کے کان میں یہ سرگوشی کر دی کہ یہ تحریک قومی تحریکِ آزادی کو ناکام بنانے کے لئے انگریز کے اشارے پر شروع کی گئی ہے۔ یہ جھوٹ جو کم و بیش ایک صدی سے دہرایا جا رہا تھا۔ ایسا مؤثر ثابت ہوا کہ ممالکِ اسلامیہ میں مطالبہ پاکستان کے اُلٹے معنے لئے گئے۔ یہاں تک کہ افغانستان اور مصر سے پاکستان کے تعلقات ہزار جتن کرنے پر بھی آج تک استوار نہیں ہو سکے[1]۔ ہندو کو ڈر برصغیر کے مسلمانوں ہی سے ہے۔ کیونکہ یہ مسلمان صدیوں کے مسلسل تجربے کی بنا پر ہندو کا اصلی روپ پہچانتا ہے۔ ممالکِ مسلمہ میں کوئی اور ہندو کے صحیح خد و خال کو نہیں پہچانتا۔ اسی لئے ہندو، ایک طرف یہاں کے مسلمانوں کو بدنام کر کے ہمسایہ مسلمانوں سے دور رکھنا چاہتا ہے دوسری طرف وہ ان کے استیصال کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہتا۔ پاکستان بھارت کے راستے میں حائل نہ ہو تو اس کا راستہ ہر طرح صاف ہو جائے۔

اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہندو یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ خود مسلمانوں میں غلط فہمیاں پھیلانے لگے تاکہ وہ آپس میں بھٹے رہیں اور اس کے خلاف متحد نہ ہو سکیں اور یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کی توجہ کا مرکز وہ خود بنا رہے اور ان کی مدد سے وہ بالآخر پاکستان کو ختم کر سکے۔ گویا ہندو جو مقصد تنہا انگریز کی مدد سے حاصل نہ کر سکا، وہ اب عالمی طاقتوں کی سرپرستی سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے عالمی کردار کا محور ایک ہی جذبہ ہے اور وہ ہے پاکستان دشمنی۔ اور ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے پاکستان کا خاتمہ۔ اس کا

[1] غنیمت ہے کہ اب افغانستان سے تعلقات خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں۔

جینا اور مرنا پاکستان کے خاتمے کے لئے ہیں۔ اس ایک نقطے میں اس کے سارے عالمی کردار کا راز مضمر ہے اس کردار کا مظاہرہ وہ غیر شعوری طور پر کرتا ہے اور قدم قدم پر۔ اور اس میں وہ بڑی پیش بینی کا ثبوت دیتا ہے۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد جب اسے پاکستان ناگزیر نظر آیا تو اس نے فوراً پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ علاقے سے محروم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے انگریز سے بھرپور سازش کی۔ گو فوری طور پر تقسیم برطانوی ہند کی مقصود تھی، اس نے ریاستوں کے مستقبل کو فراموش نہیں کیا اور پنجاب کی تقسیم اس طریق سے کرائی کہ کل وقت آنے پر وہ کشمیر تک پہنچ سکے۔ وہ بظاہر صلح صفائی کی باتیں کرتا رہا لیکن در پردہ اپنے عزائم کی تکمیل میں لگا رہا۔ ریاستوں کے الحاق کے بارے میں اس نے پاکستان کو باتوں میں الجھائے رکھا۔ لیکن فیصلہ اس نے اپنی مرضی کے مطابق دیدہ دلیرانہ فوجی کاروائی سے کیا۔ جوناگڈھ نے پاکستان سے الحاق کیا تو گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ الحاق کا اصول کیا وضع کیا جائے تاکہ تمام ریاستوں کا فیصلہ اس کے مطابق ہو جائے لیکن ایک دن اچانک اس نے ریاست پر چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ کشمیر سے متعلق اس نے اہل کشمیر کو جھکمہ دیا، پاکستان سے جھوٹے وعدے کئے اور اقوام متحدہ کو دھوکا دیا۔ حیدرآباد کا فیصلہ بھی اس نے طاقت کے زور پر کیا۔ وہاں بھی وہ پاکستان کے خلاف ہی لڑ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے حیدرآباد پر قائداعظمؒ کی وفات کے فوراً بعد حملہ کیا۔ یہ دراصل اس کی جنگی مشقیں تھیں پاکستان کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لئے۔ اس نے شروع سے ہی طے کر لیا تھا کہ پاکستان از خود ختم نہ ہو گیا تو اسے طاقت کے بل بوتے پر ختم کیا جائے گا۔ اس نے ہر کوشش کر دیکھی کہ یہ نئی مسلمان مملکت چلنے نہ پائے۔ اس کے علی الرغم پاکستان قائم رہا تو اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اسی ایک نقطہ پر توجہ مرکوز کر لی کہ جنگی تیاریاں کر کے بالآخر پاکستان کو ختم کر دے، روس، امریکہ اور چین یعنے دنیا کی تین سب سے بڑی طاقتوں سے اس نے برسوں سازباز کی، تاکہ پاکستان کو غلط کردار اور ناخواندہ ملک ثابت کر کے اس کے خاتمے کا جواز پیدا کرے۔ اور ان سب وسائل سے استفادہ کر کے اس ملک کو ایک ہی ضرب میں ختم کر دے۔ چین تو اس کے فریب میں نہیں آسکا لیکن روس اور امریکہ اپنے اپنے مصالح کی بنا پر اس کا ساتھ دیئے جا رہے ہیں اور اس کے عزائم کی تکمیل میں ممد اور معاون بنے ہوتے ہیں۔ روس اور امریکہ کی بھارت میں کیا دلچسپی ہے اور ان کی باہمی مسابقت کا کیا نتیجہ نکلے گا، اس کا جواب "ستمبر کے "طلوع اسلام" میں آچکا ہے۔ بھارت کے لئے یہ امکان بالکل تشویشناک نہیں کہ ان دو پاٹوں میں وہ پس جائے گا۔ اس کی دلچسپی پاکستان کے ختم کرنے میں ہے اور اس کے لئے وہ سرپٹ جا رہا ہے۔ بھارت کو نہ آزادی چاہیئے تھی اور نہ آزادی کا تحفظ ہی اسے مقصود ہے۔ وہ دوسرے سے مل کر پاکستان کو ختم کرنا چاہتا ہے کیونکہ پاکستان نے آزادی دلا کر برہمن کو شتری کے چھتر سے محروم کر دیا۔ برہمن لے

نہ حکومت کی ہے، نہ وہ اپنی حکومت چاہتا ہے۔ اسے شودر اور ویش چاہئیں، جو ہر طرح اس کی خدمت کریں۔ اسے کشتری چاہئیں، جو کاروبارِ حکومت چلائیں اور برہمن کے مفادات اور اجاروں کے نگہبان ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ حکومت کشتری کرے، اور حکم برہمن کا چلے۔ مسلمان نے برہمن کو آزادی سے ہمکنار کر کے روایتی کشتریوں سے محروم کر دیا۔ یہ ورن آشرم پر کاری ضرب ہے۔ برہمن نے گنگا اور جمنا کی زہرناکیوں سے نفرت کے اس برگد کو اس لئے نہیں پروان چڑھایا تھا کہ مسلمان اسے بیخ و بن سے اکھاڑ دیں۔ برہمن کی نظر میں مسلمان محسن نہیں ظالم ہے۔ وہ اس ظالم کو نگل نہیں سکا تو اسے اگل دینا چاہتا ہے تاکہ روس اور امریکہ سے کشتری بلا کے وہ پھر سے سنگھاسن جمائے اور بساطِ انسانیت کو پھر سے نفرت کی لمبی چوڑی لکیروں سے چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ کر اپنے لئے بازی گاہ بنالے۔ یہ ہے بھارت کا عالمی کردار اسی سے پاکستان کے تاریخی، عالمی کردار کے خطوط واضح ہوتے ہیں ـــــ یہ بحث دوسری نشست میں چھیڑی جائے گی۔ انشاء اللہ!

طلوعِ اسلام کی کتابیں

یہاں سے بھی مل سکتی ہیں

لاہور

۱۔ انٹرنیشنل بک سروس ۔۔ ۔۔ ۵، ۷ دی مال۔
۲۔ گوشۂ ادب ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی۔
۳۔ کلاسک بک سیلرز ۔۔ ۔۔ ۴۲ دی مال۔
۴۔ مرکزِ ادب ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی۔
۵۔ مکتبۂ پاکستان ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی۔
۶۔ آئیڈیل بک ہاؤس ۔۔ ۔۔ ۱۹۴۔ انارکلی۔
۷۔ اوریگا بک سٹال ۔۔ ۔۔ اوریگا سینما گلبرگ
۸۔ بک سنٹر ۔۔ ۔۔ چوک ریگل۔ دی مال۔
۹۔ کواپریٹو بک شاپ ۔۔ ۔۔ دی مال
۱۰۔ لاہور بک ڈپو ۔۔ ۶۵۔ دی مال
۱۱۔ نیشنل بک سٹال ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی
۱۲۔ مقبول اکیڈمی ۔۔ ۔۔ سرکلر روڈ
۱۳۔ بک ہلپس ۔۔ ۔۔ گلبرگ مارکیٹ
۱۴۔ ادبستان ۔۔ ۔۔ چوک لکشمی

لائلپور

۱۔ شریف سنز بک سیلرز ۔۔ ۔۔ کارخانہ بازار

ملتان

۱۔ دانش کدہ حسین آگاہی۔

کراچی

۱۔ محمد اسلام صاحب ۲/۱۰۲۔ لوسن روڈ نیو ٹاؤن
۲۔ انوار کی صبح۔ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ۔ نزد سعید منزل۔

باب المراسلات

زر۔ زمین۔ زن

سوال :- ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ تین ہی چیزیں ہیں۔ یعنے — زر۔ زمین اور زن — قرآن مجید نوع انسانی کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ اس نے ان معاملات کا حل کیا تجویز کیا ہے جن کا تعلق زر۔ زمین اور زن سے ہے۔

جواب :- اس بحث میں الجھے بغیر کہ دنیا میں فساد کا سرچشمہ یہی تین چیزیں ہیں یا کچھ اور بھی۔ مختصر الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ انہیں فساد کا سرچشمہ کس طرح بنا لیا گیا ہے اور قرآن کریم کی رُو سے ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ پہلے زرؔ کو لیجئے۔ زر سے مفہوم ہے دولت جو عام طور پر سکوں کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں سکہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ زندگی کی ضروریات کے لئے اشیاء کا تبادلہ ہوتا تھا (جسے BARTER SYSTEM کہا جاتا ہے)۔ زید کے پاس گندم ہے۔ بکر کے پاس تیل۔ زید نے بکر کو کچھ گندم دے دیا اور اس سے تیل لے لیا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے (اور اب بھی اکثر مقامات پر) دیہات میں یہی رواج ہے۔ وہاں سکہ کے مقابلہ میں اشیاء ہی کا تبادلہ ہوتا ہے عربی زبان میں اب بیعؔ کا لفظ بیچنے اور شریٰ کا لفظ خریدنے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ دونوں لفظ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں معنوں میں استعمال ہوتے تھے۔ یعنی بیع کے معنی صرف فروخت کرنا نہیں تھے۔ اس کے معنی 'بیچنا اور خریدنا تھے۔ اسی طرح شریٰ کے معنے جب جنس کا تبادلہ جنس سے ہو تو اس میں بیچنا اور خریدنا بیک وقت ہوتا ہے۔ زید جب گیہوں دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تیل لیتا بھی ہے۔ اور بکر جب تیل دیتا ہے تو گندم لیتا بھی ہے۔ اس نہج زندگی میں کسی شے کے ذخیرہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب تمدنی ضروریات ذرا آگے بڑھیں اور آبادی کی وسعتیں

پھیلیں، تو بغرضِ سہولت سکہ ایجاد کیا گیا۔ اب زید عمر کے ہاتھ کچھ گیہوں بیچکر کچھ سکے لیتا تھا۔ اور ان سکوں کے عوض بکر سے تیل خریدتا تھا۔ اور فاضلہ سکے اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ یہ "فاضلہ سکے" (جسے SURPLUS MONEY کہا جاتا ہے) بنیاد ہے اس فساد کی جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اور جس کا رونا ساری دنیا رو رہی ہے۔ اسی فاضلہ دولت سے سامانِ معیشت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ کیا جاتا ہے، تاکہ دوسروں کی محنت کو غصب کیا جائے۔ حتیٰ کہ یہی فاضلہ دولت دوسروں کو بطورِ قرض دے کر، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر، ان کی کمائی میں شرکت کر لی جاتی ہے۔ اس سے ان غریبوں کی کمائی ہی دوسروں کے ہاں نہیں چلی جاتی ان کی آزادی بھی سلب ہو جاتی ہے۔ ان کی حمیت و غیرت تک بک جاتی ہے۔ ان کی عزت و آبرو تک کے سودے ہونے لگتے ہیں۔ ادھر سے افراطِ زر سے وہ تمام خرابیاں ابھرتی چلی جاتی ہیں جو سرمایہ دار طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں جس سے وہ غریبوں کی اس تمام متاع کا خریدار بن جاتا ہے ان ناہمواریوں سے وہ فساد رونما ہوتا ہے جو دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی۔ لفظ "دولت" کے معنے گردش کرنے کے ہیں۔ فاضلہ دولت گردش نہیں کرتی، بلکہ ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم، دولت کے ایک جگہ جمع ہو جانے کا نتیجہ "جہنم" قرار دیتا ہے۔ اور ایسا کرنے والوں کو انسانیت کا بدترین مجرم ٹھیراتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴)۔ جو لوگ چاندی سونے کے سکے دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ (نوعِ انسان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس عذاب کے متعلق اگلی آیت میں ہے کہ ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور ان سے ان، دولت جمع کرنے والوں، کی پیشانی، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے دبا کر رکھ دیا تھا۔ اب اپنے اس طرزِ عمل کا نتیجہ دیکھو۔ وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ "جہنم آوازیں دے دیکر بلاتی ہے"۔ وہ کسے بلاتی ہے؟ اُسے کہ — جَمَعَ فَاَوْعٰی۔ (۷۰/۱۸) جو دولت جمع کرتا ہے۔ اور پھر اپنی ہمیانی کا منہ کس کر باندھ رکھتا ہے۔ سورۃ الھمزہ میں ہے۔ تباہی اور بربادی مقدر ہے اس کے لئے جس کی روش یہ ہو کہ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ (۱۰۴/۲) جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر حساب کرتا رہتا ہے کہ یہ کتنی ہو گئی اور کتنی کسر رہ گئی۔ اس کے بعد اس "آتشِ سوزاں" کا ذکر ہے جو اس ذہنیت کا فطری نتیجہ ہے اور جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

یہ تو رہا دولت کے جمع کرنے کے متعلق۔ اس کے گردش کرنے کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اس کا انداز یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (۵۹/۷)۔ اس کی گردش، خونِ زندگی کی طرح معاشرہ کی رگ رگ میں ہونی چاہیئے، تاکہ ہر ایک کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

ان اصولی ھدایات کے بعد اس نے اس کی عملی تدبیر یہ بتائی کہ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت کھلی رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زاید ہے، سب کی سب۔ اس سے قرآن کریم نے ' فاضلہ دولت ' کے تصور کو عملاً ختم کر دیا۔ یہ قرآن کریم کے عطا کردہ نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ اور اس سے ان تمام خرابیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو " زر " کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نظام میں نہ کسی کی ضرورت رُکی رہتی ہے (کہ ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری خود نظامِ معاشرہ پر ہوتی ہے۔ اسی کو نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے) اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے۔ اس سے ان خرابیوں کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو مفلسی اور ناداری (ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکنے) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور ان خرابیوں کا بھی جو افراطِ زر (فاضلہ دولت) کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

زمین

اب آیئے زمین کی طرف۔

خدا نے انسان (بلکہ ہر ذیحیات) کو پیدا کیا، تو جن چیزوں پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا انہیں بھی ساتھ ہی (بلکہ ان سے بھی پہلے) مہیا کر دیا ــــ ہوا۔ پانی۔ روشنی۔ حرارت۔ اور زمین ــــ جس میں غذا کا " ذخیرہ " جمع رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں (ذرائع زلیست) تمام ذی حیات کے لئے سامانِ زندگی کے طور پر دی گئی تھیں، نہ کہ کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کے لئے جاگیریں کھڑی کرنے کے لئے ــــ انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں، ان اشیاء میں سے کسی شے پر " ملکیت " کا تصور ہی نہیں تھا ــــ اُن کی زبان میں " ملکیت " کا لفظ ہی نہیں ملتا۔ " متاع " (فائدہ حاصل کرنے) کا لفظ ملتا ہے ــــ ضمناً یہی لفظ ــــ " متاع " قرآن کریم نے استعمال کیا ہے جب کہا ہے کہ ــــ وَلَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ (۲/۳۶)۔ تمہارے لئے زمین میں ایک مدت کے لئے رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا (یعنے سامانِ زلیست حاصل کرنا) ہے۔

انسانوں کو زمین سے سامانِ زلیست حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ابتدائی تمدنی زندگی میں ہر شخص اپنے لئے آپ ہی محنت کرتا تھا۔ اس سے اگلے دور میں، طاقتور انسانوں نے کمزور

انسانوں کو اپنا غلام بنا کر ان سے محنت کرانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ ان سے محنت کراتے تھے اور انہیں روٹی دیتے تھے۔ وہ دن نوعِ انسانی کی زندگی میں انتہائی بدبختی کا تھا۔ جب ان غلاموں نے زمین سے اتنا پیدا کر کے اپنے آقا کو دیا جو ان کی روٹی کے خرچ سے زیادہ تھا۔ اس سے زمین، سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے، دولت کمانے کا ذریعہ بن گئی۔ اور اسی سے اس پر "ملکیت" کا تصور پیدا ہوا۔ بس پھر کیا تھا؟ ہر طاقت ور نے زمین کے رقبوں پر لکیریں کھینچ کر انہیں اپنی اپنی ملکیت بنا لیا۔ اور پھر یہی ملکیت، اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہونے لگی۔ یوں زمین، سامانِ زیست کی برکات کا سرچشمہ بننے کی بجائے، مرگ آور فسادات کا موجب بن گئی۔

قرآن کریم نے زمین کو ملکیت کی شے قرار دینے کے بجائے، متاع — یعنے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جس پر تمام نوعِ انسان کا، اسی طرح یکساں حق ہے جس طرح ہر سانس لینے والے کا ہوا پر یکساں حق ہوتا ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے — سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ (۴۱/۱۰) اسے ہر ضرورت مند کی ضرورت پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے — مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ۔ (۷۹/۳۳) تمہارے اور تمہارے مال مویشیوں کے لئے سامانِ زیست کا ذریعہ۔

چونکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں تقسیمِ کار کا اصول کارفرما ہوتا ہے جس کی رُو سے یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد اپنے اپنے طور پر زمین سے رزق حاصل کرے، اس لئے قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کا اس قسم کا انتظام کرے جس سے یہ چند افراد کی ملکیت بننے کے بجائے تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ ہر متنفس) کو سامانِ زیست بہم پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ جب اس نے کہا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۶/۱۱)۔ (زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لی ہو) تو اس سے مطلب یہی ہے کہ ذرائع رزق خدا نے پیدا کر دیئے ہیں۔ انسانی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ ان کا نظم و نسق اس طرح کرے کہ ان سے ہر ذی حیات کو سامانِ زندگی ملتا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ ذرائع رزق کو انفرادی ملکیت میں دے دینگے۔ تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ ان کا مالک، انہیں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات پورا کرنے کا ذریعہ بننے کے بجائے اپنے مفاد حاصل کرنے کا وسیلہ بنا کر بیٹھ جائے گا۔

چنانچہ قرآن کریم نے (کافروں، ملحدوں، بے دینوں کے لئے ہی نہیں بلکہ) ان نمازیوں (مصلیین) کے لئے تباہی اور بربادی بتائی ہے جو يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۔ (۷/۱۰۷) کرتے ہیں۔ یعنے رزق کے ان ذرائع کو

جنہیں چشموں کے بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہیئے، بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ اور ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں یعنے دین سے انکار کر کے، غیر مسلموں کی صف میں نہیں چلے جاتے۔ زبان سے تو اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن رزق کے سرچشموں پر بند لگا کر عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں، "تکذیب" کا لفظ غور طلب ہے۔ اس کے معنے ہوتے ہیں کسی کو جھوٹا ثابت کرنا۔ دین کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کو سامانِ زیست بہم پہنچتا رہتا ہے۔ دین سچا اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ جو معاشرہ دین کا مدعی ہو اس میں سامانِ زیست ہر ایک تک پہنچتا رہے۔ لیکن اگر ایک معاشرہ دین کا مدعی بھی ہو اور اس میں کیفیت یہ ہو کہ رزق بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات پورا کرنے کا موجب نہ رہے، تو اس سے دنیا لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچے گی کہ اس دین کا یہ دعویٰ کہ اس میں کوئی فرد رزق سے محروم نہیں رہ سکتا، جھوٹا ہے۔ یوں یہ دین کے مدعی (مصلیین) اپنے طرزِ عمل سے، دین کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔

یوں قرآن کریم نے "زمین" کو موجب فساد بننے کے بجائے باعثِ رحمت بنا دیا۔

زن

اب "زن" کے سوال کو لیجئے۔

"زن" سے مراد ہے جنسی مسئلہ (SEX PROBLEM)۔ انسان نے اپنی زندگی میں جس قدر بدنہادیاں (PERVERSIONS) پیدا کی ہیں، ان میں سب سے زیادہ شدید، سنگین، فساد انگیز اور تباہ کن بدنہادی، جنسیات (SEX) سے متعلق ہے۔

سیدھے سادے، کھلے کھلے، واضح، غیر مبہم الفاظ میں، نر اور مادہ کا جنسی اختلاط، افزائشِ نسل کا ذریعہ ہے۔ اس سے فطرت کا مقصود ہی یہ تھا۔ افزائشِ نسل کے سلسلہ میں بہت سی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اس سے فطرت کو خدشہ لاحق ہوا کہ ان کی وجہ سے افزائشِ نسل کا سلسلہ ہی نہ رک جائے اس اندیشہ کے پیشِ نظر اس نے اس اختلاط میں ایک خاص حظ وکیف پیدا کر دیا، ایک لذت رکھ دی۔ یعنی اس نے اس کڑوی گولی کو (SUGAR CORTED) بنا دیا۔

حیوانات کو چونکہ اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا، اس لئے ان کی صورت میں جنسی اختلاط پر فطرت نے اپنا کنٹرول رکھا۔ وہ انہیں اس اختلاط کی اجازت اس وقت دیتی ہے جب افزائشِ نسل کے عمل کا وقت آتا ہے۔ وہ اُس وقت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ انہیں اس پر مجبور کر دیتی ہے ایک سانڈ صبح شام گایوں کے گلے میں چرتا پھرتا رہتا ہے۔ نہ کوئی گائے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے

نہ وہ اس کے پیچھے مارے مارے پھرتا ہے۔ لیکن جب (MATING SEASON) آتا ہے تو فطرت کی طرف سے "چاکِ دامان"[1] کے ادنیٰ سے اشارے پر، وہ دونوں مضطرب و بیتاب ہو جاتے ہیں لیکن جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان میں پھر وہی بے رغبتی اور بے گانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ان کے ہاں اس "آتش" کی کیفیت (غالب کے الفاظ میں) یہی ہوتی ہے ۔ کہ

لگائے نہ لگے ، اور بجھائے نہ بجھے !

لیکن انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی اس کے مقامِ باند کا تقاضا تھا۔ اسی میں اس کے شرف و مجد کا راز تھا۔

لیکن اسی اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے یہ حیوانات سے بھی پست سطح پر پہنچ جاتا ہے ۔ کالانعام بل ھم اضل ۔ یعنی اس نے جنسی اختلاط کے مقصد ۔ افزائشِ نسل ۔ کو تو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے حظ و لذات کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ اور اس کے بعد اپنے اس اختیار و ارادہ سے اس جذبہ کو جب چاہے بیدار کر لیا[2]۔ اب سوچئے کہ اگر جنسی اختلاط کی لذت کو (جو شدت اور ارتکاز میں اپنی مثال نہیں رکھتی) مقصود بالذات قرار دے لیا جائے، اور یہ چیز انسان کے اپنے اختیار میں ہو کہ وہ جب جی چاہے جنسی جذبہ کو بیدار کر کے، یہ لذت حاصل کر لے، تو اس دوہری غیر فطری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہوگا۔

اس بد نہادی کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ مرد نے، عورت کو اپنے جیسا انسان سمجھنے کے بجائے، اسے اپنی لذت یابی کا ذریعہ قرار دے لیا۔ وہ انسان (HUMAN BEING) ہونے کے بجائے، ایک

---

[1] چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے ! (غالب)

[2] جنسی جذبہ کی کیفیت بھوک یا پیاس کے تقاضوں کی طرح نہیں جو جسم کی ضرورت کے لئے از خود بیدار ہوتے اور شدت اختیار کئے چلے جاتے ہیں۔ جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال کے ماتحت بیدار ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس حیاتیاتی تقاضے (BIOLOGICAL NECESSITIES) ہیں۔ لیکن جنسی جذبہ نفسیاتی تحرک (PSYCHOLOGICAL - URGE) ہے۔ اس لئے اس کا بیدار کرنا یا خوابیدہ رہنے دینا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے خوابیدہ رکھنے سے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کے مقالات "جنسیات کا اثر تمدن پر" اور "ضبطِ ولادت" میں دیکھئے جو "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم میں شائع ہو چکے ہیں۔

جنس (COMMODITY) یا استعمال کی شے متصور ہونے لگی، جسے خریدا جا سکتا ہے، بیچا جا سکتا ہے، کرائے پر لیا جا سکتا ہے۔ (بصد معذرت) "استعمال کے قابل" نہ رہنے کی صورت میں اٹھا کر پھینک دیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ اور "جنس" لائی جا سکتی ہے۔ عورت کو جنسی لذت کے حصول کا "آلہ" (INSTRUMENT) سمجھنے کا تصور اس قدر عالمگیر اور انسان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکا ہے، کہ (وقتی طور پر اختلاط تو ایک طرف رہا) دنیا کی ہر قوم میں (کم از کم ہر "مہذب" قوم میں) نکاح، شادی، یا (MARRIAGE) اور۔ شب عروسی، شب زفاف (HONEY MOON) لازم و ملزوم قرار پا چکے ہیں۔ اگر کہیں شادی کی تاریخ ایسی مقرر ہو جاتی ہے جبکہ لڑکی (دلہن) ایام سے ہو (اور ایام میں اختلاط کو جائز نہ سمجھا جاتا ہو) تو اسے انتہائی بدتہذیبی اور بے تمیزی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر شب اول اختلاط کا عمل سرزد نہ ہو تو قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگ جاتی ہیں۔ انسانیت کی اس سے بڑی تذلیل تصور میں بھی آ سکتی ہے؟

یہ ہے "زن" کا وہ مسئلہ جس نے عالم انسانیت میں فساد ہی فساد برپا کر رکھا ہے۔ ہر شخص اس "آلۂ حصولِ لذت" کو اپنے تصرف میں رکھنا اور اس سے زیادہ سے زیادہ لذت گیر ہونا چاہتا ہے۔

قرآن آیا اور اس نے یہ اعلانِ عظیم کیا کہ:

(۱) مرد اور عورت دونوں، نوع انسان (HUMANITY) کے اجزا ہیں اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام عالمِ انسانیت ہے۔ انسانیت (HUMANITY) صرف (MAN-KIND) نہیں۔ بلکہ (MAN AND WOMAN KIND) ہے۔

(۲) عورت اور مرد مصافِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ (سورۂ احزاب کی آیت ۳۵ میں دیکھئے۔ وہ کس طرح شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں)

(۳) مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی الگ انفرادیت (INDIVIDUALITY) رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے کوئی ایک، دوسرے کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

(۴) افزائشِ نسل کے سلسلہ میں مرد اور عورت کی طبیعی ساخت اور وظائف میں فرق ہے۔ لیکن اس سے ان کی انسانیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۵) حیوانات میں صرف بچہ پیدا کرنا یا اس کی طبیعی پرورش مقصود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی صورت میں بچے کی ولادت اور طبیعی پرورش کے علاوہ اس کی تربیت بھی نہایت ضروری ہوتی ہے جس کی

ذمہ داری ماں اور باپ دونوں پر عاید ہوتی ہے۔ اس لئے اس جوڑے کا باہمی تعلق جنسی اختلاط کا نہیں بلکہ رفاقت (COMPANION SHIP) کا ہوتا ہے۔ اس رفاقت کے لئے وہ باہمی معاہدہ کرتے ہیں جسے نکاح کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصد محض جنسی اختلاط کا جائز قرار پانا نہیں ہوتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مساوی رفاقت کا اقرار ہوتا ہے۔

(۶) جنسی اختلاط کا مقصد حصولِ لذت نہیں بلکہ افزائشِ نسل ہے جب افزائشِ نسل مقصود نہ ہو تو جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۷) افزائشِ نسل کے لئے جنسی اختلاط بھی صرف اس جوڑے میں جائز قرار پا سکتا ہے جس نے زندگی کی رفاقت کا معاہدہ کیا ہو۔

(۸) اور جب صورت یہ ہو تو پھر (اس جوڑے سے باہر) کسی مرد یا عورت کے ساتھ جنسی اختلاط تو ایک طرف اس کے تصور تک کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تحفظِ عصمت (CHASTITY) کا تقاضا 'مرد اور عورت دونوں سے بالکل یکساں کیا ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا دونوں کے لئے ایک جیسی مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کہ (جیسا کہ دنیا میں عام طور پر ہو رہا ہے) مردوں کے لئے فحش کاری معاشرہ کا عام معمول سمجھ لیا جائے اور عورت سے اس کا تقاضا سخت ترین ہو۔ فحش کار تو ایک طرف، قرآن تو نگاہ کی خیانت بھی مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں جرم قرار دیتا ہے۔

(۹) لڑکے اور لڑکی ۔۔ مرد اور عورت کے متعلق گفتگو اسی انداز سے ہوگی جس انداز سے دو انسانوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ ان میں جنس (SEX) کی تفریق اس وقت سامنے آئے گی جب ان کے حیاتیاتی خصائص (BIOLOGICAL CHARACTERISTICS) کے ذکر کرنے کی ضرورت ہو۔

یہ ہے وہ اندازِ نگاہ جسے پیدا کرنے سے قرآن کریم "زن" کے مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ جب تک یہ انداز نظر پیدا نہیں ہوتا، یہ دنیا بدستور جہنم بنی رہے گی۔

یہ ہیں "زر، زمین، اور زن" کے پیدا کردہ مسائلِ حیات کے متعلق قرآنِ کریم کے پیش کردہ حل۔ آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا ان سے وہ تمام مفسدات مٹ نہیں جاتے جو انکے متعلق انسانوں کے خود ساختہ اندازِ نگاہ اور طرزِ زندگی کے پیدا کردہ ہیں اور جن کی وجہ سے پورا عالم انسانیت جہنم کی آگ میں جھلس رہا ہے اور ہزاروں کوششوں کے باوجود اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہیں ملتا۔ یہ راستہ قرآن کریم کی تجویز کردہ "صراطِ مستقیم" کے سوا اور کوئی نہیں ۔۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

عسکری انقلاب کی یاد میں

خوش بختی دستک دے رہی ہے!

"یوسف زلیخا" (پنجابی) کے مصنف، مولانا غلام رسول، ایک قلبِ گداز رکھنے والے صاحبِ قلم تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ایسے انداز سے بات کر جاتے ہیں جس سے دل میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقام ہے جہاں (حضرت یوسفؑ، مصر کے بازار میں بیچے جا رہے تھے۔ زلیخا اس سے پہلے، نادیدہ ان پر عاشق ہو چکی تھی، اور انہیں اکثر اپنے خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ بھی اس منڈی میں آ نکلتی ہے اور جونہی اس کی نگاہ، اس بکنے والے غلام پر پڑتی ہے، وہ وجد و کیف کے عالم میں کھو جاتی ہے کہ یہ تو وہی جانِ زلیخا ہے جس کے فراق میں وہ اتنے عرصہ سے تڑپ رہی تھی۔ زلیخا، مصر کے بہت بڑے سردار کی بیوی ہے۔ اس لئے دولت کی اس کے پاس کچھ کمی نہیں۔ اس منظر کشی کے بعد، مولانا غلام رسول لکھتے ہیں کہ :-

جس نوں یار وکیندا لبھے، تے قیمت ہووے پلے
اُس دے جیڈ نہ طالع کوئی، اُس دے بھاگ سوا لے

جسے محبوب بازار میں بکتا ملے، اور اس کی گرہ میں اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں۔ اُس جیسا خوش نصیب دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑا ہی طالعمند ہے۔

اب آپ بازارِ مصر سے شاہراہِ پاکستان کی طرف آجائیے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ مملکتِ پاکستان میں ایک عظیم (عسکری) انقلاب آیا، اور زمامِ اقتدار سیاسی مدبروں کے قبضے سے نکل کر، ایک مردِ کارزار کے ہاتھ میں آگئی۔ اس سے پہلے، دنیا کے کئی ملکوں میں فوجی انقلابات آ چکے تھے اور ان کی وجہ سے قتل و غارت گری کے جو انسانیت کش واقعات رونما ہوئے تھے وہ لوگوں کی یاد میں تھے۔ اس لئے لامحالہ ہر قلبِ حساس سینہ میں دھک دھک کر رہا تھا کہ نہ معلوم اس بدقسمت

ملک پر کیا گزرے۔ لیکن ان کا یہ خطرہ انتہائی سکون و اطمینان میں بدل گیا جب انہوں نے دیکھا، کہ یہ انقلاب خون تو ایک طرف، پسینے کا ایک قطرہ بہائے بغیر عمل میں آگیا۔

اس کے بعد، بہی خواہانِ ملت کے دلوں میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ خدا معلوم، اقتدارِ نو کے ماتحت مملکت کی پالیسی کیا ہو، اور پاکستان کے مستقبل کے لئے کون سے خطوط وضع کئے جائیں۔ لیکن ان قیاسات کے بادل بھی بہت جلد چھٹ گئے جب قائد انقلاب، (فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان نے مختلف مقامات پر اپنی تقاریر اور بیانات میں اس حقیقت کو غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دیا (اور اسے بار بار دہراتے رہے) کہ یہ نظامِ نو، اسی آئیڈیالوجی کے احیاء اور استحکام کے لئے مصروفِ کار رہے گا جس کے لئے یہ پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ہم ان تقاریر اور بیانات کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیشِ نظر لا چکے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا بار بار اعادہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے وہ مقصدِ عظیم نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ اور وہ وعدے پھر سے مستحضر ہو جاتے ہیں جو قوم سے (ہی نہیں بلکہ خدا سے بھی) بار بار کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم اس انقلاب کی سالگرہ کی تقریب پر، ان میں سے چند ایک کے اقتباسات زینتِ دہِ اوراقِ طلوعِ اسلام کرتے ہیں۔

راولپنڈی کی تقریر

عسکری انقلاب کے چھ ہی ماہ بعد، صدر ایوب نے (۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو) راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ اس آئیڈیالوجی کا احیاء و استحکام عمل میں لائیں جس کی رو سے پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور قدامت پرستی کی دلیل) ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجبِ صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی، بنی نوعِ انسان سے محبت، ہمسایہ سے مودت، یتیموں کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۷ مارچ ۵۹ء)

کمشنرز کانفرنس۔ مری

اس کے ٹھیک چار ماہ بعد (۶ جولائی ۱۹۵۹ء کو) مری میں، مغربی پاکستان کے کمشنروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبئین عصرِ حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کی روح کو اسلام سے کشید کیا جائے، اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے، اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے۔ کہ وہ (زندگی کے ان مسائل کا) نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے۔ کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔　　(پاکستان ٹائمز۔ ۷ جولائی ۵۹ء)

دارالعلوم ٹنڈو الہ یار

مئی ۵۹ء میں صدرِ محترم نے، دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں، علماء کے ایک اجتماعِ کثیر سے خطاب کیا یہ خطاب اس قابل ہے کہ اس کی وسیع نشر و اشاعت ہو اور اسے بار بار دہرایا جائے۔ انہوں نے اسلام کے صدر اول کی عالمتاب انقلاب آفرینی کی یاد تازہ کراتے ہوئے فرمایا۔

'کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زورِ دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جدوجہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔　　(پاکستان ٹائمز۔ ۴ مئی ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

"جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں

سے اوجھل ہوگیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جارہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنے مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہوکر رہ گئے۔" (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ۔

"جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جاتے تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت، یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہوکر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے، لیکن ہمارا مذہب ایک ہی مقام پر ساکت وصامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔" (ایضاً)

اس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوتے انہوں نے فرمایا۔

"مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے، یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوتے آگے قدم اٹھایا، ان پر "دنیا دار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ، مستقبل کیطرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے، اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس و دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔" (ایضاً)

اپنے اس دعوے کی شہادت پیش کرتے ہوتے صدرِ مملکت نے علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی کہ:۔

"میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہوکر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے

کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جاتے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں، ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جاتے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔" (ایضاً)

اس کے بعد صدرِ مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند۔ زندہ دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟ اس کے جواب میں، انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوتے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا۔؟

(۲) یا ہم نے اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کرکے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجاتے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے؛

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلاتے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمرہ ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔" (ایضاً)

ان سوالات کو پیش کرتے ہوتے انہوں نے علماء حضرات کو ایک اہم مشورہ دیا اور فرمایا کہ:۔

"یہ سوالات بہت اہم ہیں اور ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسار، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوتے یقینِ محکم

کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔"

اس کے بعد صدرِ محترم نے اس خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم نہتہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی موثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں، نظامِ کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوعِ انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مذہب کی مادی اقدار (کی کشمکش) میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روحِ انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔ (ایضاً)

خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصرِ حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

پاک جمہوریہ کا دورہ

ملک کے سامنے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ یہاں قانون سازی کا اصول کیا ہو۔ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے قریب بارہ برس ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی قانون سازی کی کشتی ایک ہی مقام پر گردش کئے جا رہی تھی۔ ساحلِ مراد کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں یہی طے نہیں پا رہا تھا کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں، صدرِ مملکت نے ایک اسپیشل ٹرین (پاک جمہوریت) کے ذریعے ملک کے مختلف گوشوں کا دورہ کیا اور متعدد مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ۱۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا لیکن

(یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

یوم انقلاب ۱۹۶۰ء

اسی سلسلہ میں انہوں نے، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر ریڈیو سے قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا۔

"علامہ اقبال نے، جن کا شمار عصر حاضر میں روحِ اسلام کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے، کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمو تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوتی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گزشتہ کئی صدیوں میں جو اسلام کی قوت میں ضعف آیا ہے، تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔"

اسی نکتہ کی مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے آگے چل کر فرمایا۔

"قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عملِ تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہنمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔"

اس کے بعد وہ قومی زندگی کے عظیم مقاصد کی طرف آئے۔ اور کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں۔ اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے جس میں دین بھی شامل ہے فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن اُن جامد عقاید کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی رُوح کو تعصب، توہم پرستی، اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے " دینی جہالت " (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں) "

قاہرہ یونیورسٹی میں

نومبر ۱۹۶۰ء میں صدر مملکت نے ممالک اسلامیہ کا دورہ کیا اور مصر و حجاز کے اہم مقامات پر اس قدر بصیرت افروز تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت آج تک وہاں کی وادیوں میں گونجتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

" جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جراءت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا۔ اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک۔ اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے

اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹیفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔

(ڈان۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۶۰ء)

۷ر نومبر کو صدرِ پاکستان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) نیشنل یونین ریلی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے۔ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالمِ اسلام کی طرف نگاہ ڈالئے۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی ہے؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہنماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملّی روایات کے حفظ و بقاء کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضروری ہے اور (۲) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے، کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخرالامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہونگے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں،

بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔ (ڈان۔ ۱۵۔ نومبر ۱۹۶۰ء)

عیدالاضحےٰ کا پیغام

۱۹۶۱ء میں، عیدالاضحےٰ کی تقریب سعید پر، صدرِ محترم نے، قوم کے نام ایک نشریہ میں فرمایا۔

"بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہوگئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہوگیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اُسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے سے ہی ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے، اُسے خود اللہ تعالےٰ نے اپنے کلامِ پاک میں بہ وضاحت بیان فرمایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے۔ اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بُت بنا کر ان کی پرستش کی جائے۔ اصول تو اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں۔ اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔"

خواتین سے خطاب

انہوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کو، کراچی میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

قرآنِ کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ لیکن ان کی تشریح

وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق اُن پر عمل کرائے۔ (یاد رکھیئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے

(بحوالہ "نوائے وقت" ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

جامعہ بہاولپور میں

جس پریشان کن سوال نے ملک کو اس قدر وقفِ اضطراب بنا رکھا ہے، یہ ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کا دعویٰ یہ ہے کہ جس بات کو ہم جائز قرار دیں، اُسے جائز سمجھا جائے اور جسے ہم ناجائز کہہ دیں اُسے ملک و ملت کے لئے شجرِ ممنوعہ ٹھہرا دیا جائے اور اس طرح حکومت ہمارے نافذ کردہ فتاویٰ کے تابع چلے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ تھیاکریسی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ صدرِ محترم کو اس کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے (۹ اکتوبر ۶۳ء کو) جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا افتتاح کرتے ہوئے، اپنی تقریر کے ضمن میں کہا۔

"اگر موجودہ وقت کے ہمارے علماء کوئی ایسا فتویٰ دیدیتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں ہمیں صحیح معلوم نہیں ہوتا، تو ہمیں وہ راستہ اختیار کرنے سے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے جسے ہم صحیح سمجھتے ہوں۔ قرآنِ حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہم اپنی عقل اور دانش سے کام لیں۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ نے خود اجتہاد کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر ہم نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور فرسودہ طریقے اپنائے رکھے تو ہماری مستقبل کی نسلیں اسلام سے اسی طرح دور ہو جائیں گی جس طرح مغربی اقوام اپنے مذہب سے دور ہو گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مذہبی رہنماؤں، اور علماء کا اخلاقی، قومی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو دورِ جدید کی ضروریات پر منطبق کر کے ثابت کریں کہ یہ اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ فرسودہ نظریات سے جو بدلے ہوئے حالات میں کسی کام کے نہیں ہیں۔ سختی سے وابستگی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں مذہب سے دور ہو جائیں گی اور انہیں خوفِ خدا نہیں رہے گا۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جو عظیم کامیابی حاصل کی وہ اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے زندگیوں کا آغاز غیر مہذب لوگوں میں کیا۔ وہ آرٹ، ادب اور سائنس کے ماہر اور دنیا کے رہنما بن گئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی اسلام کے پیروکار آج پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صحابہؓ کرام کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہے۔ ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلامی فقہ کو

ہی اسلام سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار پھر عوام میں اسلام کی صحیح رُوح پیدا کیجائے"
(کوہستان - ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء)

۱۹۶۶ء میں

بات لمبی ہوتی جارہی ہے اس لئے اسے مختصر کرنے کے لئے ہم ۱۹۶۶ء میں آجاتے ہیں۔ گزشتہ جولائی میں، صدر ایوب نے، مجلس تزئین القرآن کا افتتاح کرتے ہوئے، راولپنڈی میں فرمایا۔

پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلامک آئیڈیالوجی پر ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری جداگانہ ہستی کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ہم نے اس امر کا تہیہ کر لیا کہ ہم اسلامی قوانین کے مطابق اپنی تشکیل جدید کریں گے۔ بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید خدا کی کتاب ہے اور ہماری مادی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات۔ یہ بندوں کے بندوں کے ساتھ، اور بندوں کے خدا کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کے ضوابط ہی متعین نہیں کرتی، بلکہ ایک مبنی برانصاف مملکت کے لئے اصولِ حکومت بھی عطا کرتی ہے۔ اس میں معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششوں پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ نیز اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق علوم حاصل کرنے کی بڑی تائید کی گئی ہے۔ قرآن نے قدیم فلسفیانہ نظریات، غیر اسلامی مذہبی عقاید اور عصر حاضر کے مادیانہ تصورات کا بڑی عمدگی سے مقابلہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو بنیادی اصول دیئے گئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں اور مسلمانوں نے ہر زمانے میں، اسے محفوظ رکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔

(پاکستان ٹائمز - ۲۸ جولائی ۶۶ء)

خلاصۂ مبحث

صدر محترم کی تقاریر، خطبات، اور بیانات کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت غیر مبہم طور پر سامنے آجاتی ہے کہ وہ، اپنے برسر اقتدار آنے کے یوم اول سے اس وقت تک اپنے اس ایمان اور یقین کو مسلسل اور متواتر قوم (بلکہ دنیا) کے سامنے پیش کرتے چلے جارہے ہیں کہ:-

(۱) پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جسے اسلامک آئیڈیالوجی کو عملاً نافذ اور متشکل کرنے کیلئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس نصب العین کو ترک کر دیا جائے تو ہماری جداگانہ ہستی کی کوئی وجہ جواز نہیں رہتی۔

(۲) یہ آئیڈیالوجی قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے جو ہمارے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مکمل ضابطہ اور مملکت کے لئے غیر متبدل راہنمائی ہے۔

(۳) قرآنِ کریم کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملتِ اسلامیہ، زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قوانین خود مرتب کرے گی۔

(۴) اسلام میں تھیاکریسی کا وجود نہیں جس میں مذہبی پیشواؤں کے فتاوے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔

(۵) تعصب، جہالت، قدامت پرستی اور توہم انگیزی کی جو تعلیم مذہبی پیشوائیت کی طرف سے دی جاتی ہے، جب تک اس سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جائے ہم زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔

(۶) کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے، ملک کا معاشی نظام ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے، جس سے ہر فردِ معاشرہ کو روٹی ملتی جائے۔ اس لئے کہ "انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اُسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔"

خوش بختی یا حرماں نصیبی

یہاں سے آپ پھر بازارِ مصر کی طرف لوٹ چلئے — یوسفؑ سربازار بک رہا ہو۔ زلیخا کے پاس اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں۔ اور وہ اُسے خریدے بغیر گھر واپس چلی جائے، تو آپ زلیخا کی اِس حرماں نصیبی کے متعلق کیا کہینگے؟

صدرِ مملکت، محترم محمد ایوب خان صاحب کے خیالات، نظریات، معتقدات، بلکہ ان کا ایمان، ان کی خواہشیں، ان کی آرزوئیں، ان کی تمنائیں، جن کا وہ اس شد و مد سے اظہار کرتے چلے آرہے ہیں یہ ہوں۔ اور پھر ان کے پاس اقتدار بھی اتنا وسیع ہو کہ جب جی چاہے انہیں عملی پیکر عطا کر دیں — پہلے چھ سال تک یہاں مارشل لاء نافذ رہا جس سے زیادہ ذی اختیار دور، تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اور

اس کے بعد ملک میں صدارتی نظام قائم ہوا جس میں سربراہ مملکت کے اختیارات کچھ کم نہیں ہوتے۔ یہ ہو اختیارات کی وسعت ـــ لیکن اس کے باوجود ان کے یہ تصورات، تقاریر اور بیانات کی حد سے آگے نہ بڑھیں تو اس کے متعلق، بجز اس کے کہ ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جائیں، ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے جنوری ۱۹۶۱ء میں کچھ ایسے ہی احساسات کے تابع لکھا تھا۔

ہم جناب محترم المقام صدر مملکتِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گذارش کریں گے کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ مقصد جس کے لئے اقتدار آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے مملکت میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہو گیا تو یقین مانیں، آپ کا نام جریدۂ عالم میں سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت آپ کو زمرۂ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی۔ اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی ـــ! سابقہ ارباب حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیش کش کی قدر نہ کی ـــ خدا کرے آپ ان میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے، اس پر فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں اور جب آپ بحضورِ داورِ داوار جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برساتے کہ

یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوتِ بازو
سے زمانہ میں میرا سکہ رواں ہوا!"

آج ہم اپنی اس عرضداشت کو پھر دہراتے ہوئے، صدرِ محترم کی خدمت میں بصد ادب عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اقتدار تو ایک طرف، خود انسانی زندگی ہی کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اقبال کے الفاظ میں ؎

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہ نادر موقعہ عطا کیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے اور مملکتِ پاکستان میں اس قرآنی نظام کو رائج کر جائیے جسے دیکھنے کے لئے پورا عالم انسانیت چشم براہ ہے۔ اس سے آپ ملتِ پاکستانیہ کی آنکھوں کے تارے، اور انسانیت کے محسنِ اعظم بن جائیں گے۔ تاریخ کے اوراق پر آپ کے نقوشِ قدم ابدیت در کنار ہونے کی سعادت حاصل کر لیں گے اور خدا کے ہاں آپ کا شمار اسکے صالحین

کے زمرے میں ہوگا ___ آگے بڑھئے اور خوش نصیبی کے اس ساغرِ سیمیں کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا لیجئے۔ "یوسف" بازار میں بار بار نہیں بکا کرتے۔ زمامِ اقتدار آپ کے ہاتھ میں آتی ہے تو خدا کے اس ارشادِ گرامی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیئے کہ

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ
كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۴/۱۰)

پھر تمہارے پیش روؤں کے بعد ہم نے زمامِ حکومت تمہارے ہاتھ میں دی
تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

یاد رکھیئے! خدا کا اٹل قانون کسی کی رعایت نہیں کیا کرتا ___ لہٰذا ؎

خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عُمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند!

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری۔ احساس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں
تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپکو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرینِ معاشیات و سیاسیات نے

کیا سوچا؟

اسے پڑھیئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہوکر نوعِ انسانی نے
اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا!

قیمت
بارہ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور

بزم کی تمام سرگرمیاں حسبِ معمول جاری ہیں۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت کا پروگرام کامیابی سے بروئے کار آرہا ہے۔ بزم نے ۶ ستمبر کی شام "یومِ دفاعِ پاکستان" (جسے ہم نے یوم الفتح سے تعبیر کیا ہے) کا جشنِ مسرت اس عظیم تقریب کے شایانِ شان منایا۔ تحریکِ قرآنی کا مستقر (۲۵/بی۔ گلبرگ) بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بن رہا تھا، اور رنگین قمقموں کی قوسِ قزح، دامانِ باغبان اور کفِ گلفروش کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ دانشورانِ لاہور کا منتخب گروہ باعثِ زینتِ محفل تھا۔ حسین و سادہ کھانے کے بعد، جشن کا پروگرام شروع ہوا۔ محترم نذیر فاروقی (سیالکوٹی)، شعر و نغمہ کے پُرکیف امتزاج میں جو منفرد حیثیت رکھتے ہیں اسکے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ — ہے یہ وہ مصرعِ موزوں جو مکرر نہ ہوا — اس مرتبہ ان کے علاوہ ایک اور جوہرِ تابان بھی وجۂ درخشندگیٔ محفل ہوتے۔ یہ ہیں محترم سلطان محمود آشفتہ — شعر کے لئے زبان پنجابی لیکن فکر خالص اعوانی — بارہ بجے شب تک محفل پر عجیب محویت کا عالم طاری تھا۔ جس میں، وقتاً فوقتاً، محترم خالد ڈار کا پاکیزہ مزاح، نسیمِ سحری کے جھونکوں کی طرح ہلکورے پیدا کرتا رہا — شرکائے محفل کا تاثر یہ تھا کہ ۶ ستمبر کا جشنِ مسرت پاکستان بھر میں اسی انداز سے منایا جانا چاہیئے۔ اس تقریب کی کامیابی کا سہرا، بزم کے قائم مقام نمائندہ (شیخ سراج الحق صاحب) اور ان کے رفقاء کے سر ہے۔ خدا ان کی ہمت کو اور بلند کرے۔

بزمِ کراچی

بزمِ کراچی کی جملہ سرگرمیاں حسبِ معمول جاری ہیں۔ انہوں نے ۴ ستمبر کو درسِ قرآن کریم کے بعد، ایک عام اجلاس میں "**یوم الجہاد**" کے سلسلہ میں حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

"بزمِ طلوعِ اسلام کراچی آج "یوم الجہاد" پر اپنے خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور سجدہ شکر بجالا کر ملک کے ان غیور فرزندوں کو جنہوں نے شہید ہو کر اپنے خون سے چمنِ آزادی کی آبیاری کی ہے، خراجِ تحسین

پیش کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ ان ہمیشہ زندہ رہنے والے شہداء نے دینِ اسلام کی حفاظت اور اس کی ناموس کے لئے بیش بہا قربانیاں دے کر ہمارے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک جہانِ نو پیدا کر دیا ہے ان کے یہ کارہائے نمایاں دینِ اسلام کے افق پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

ہمیں اپنی افواج پر فخر ہے اس لئے کہ ہمارے فوجی ایک ایسی امت کے افراد ہیں جو حق کی خاطر میدان میں اُتر سکتی ہے، شمشیروں کے سایے میں کلمہ پڑھ سکتی ہے اور ناموسِ دین پر قربان ہو سکتی ہے۔ دین کے ان مجاہدین کے ان کارناموں نے ملّتِ اسلامیہ کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

ہمیں پاکستانی عوام پر بھی ناز ہے جنہوں نے اس آزمائشی دور میں ملک کے دفاع میں دامے درمے سخنے پورا پورا تعاون کیا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ پاکستانی قوم جینا جانتی ہے اور جینے کے لئے ہر وقت مرنے پر تیار رہتی ہے۔ زندگی اور موت کے تقاضوں کا شعور رکھتی ہے اور اس میں اپنی خودی اور اقدار کے تحفظ کا صادق جذبہ موجود ہے۔

ہم ان ممالک کے بھی بیحد ممنون و مشکور ہیں جنہوں نے اس آڑے وقت میں ہم سے پورا پورا تعاون کیا، ہم ان ممالک کو یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان ہمیشہ ان کے صحیح رفیق ثابت ہوں گے۔

بزم طلوع اسلام کراچی اپنی مایہ ناز افواج اور صدرِ مملکت کو یقین دلاتی ہے کہ وقت پڑنے پر دین کی حفاظت اور اس کی ناموس کے لئے نہ صرف یہ کہ حکومت سے پورا پورا تعاون کرے گی، بلکہ کسی ممکنہ قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔"

بزم کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام اور ان کے رفقاء اس کے لئے مستحق مبارک باد ہیں۔

بزم سرگودہا

بزم سرگودہا کی طرف سے حسب ذیل رپورٹ موصول ہوئی ہے۔

بزم کے خصوصی اجلاس میں چوہدری ارشد محمود ارشد صاحب کو اتفاق رائے سے نیا نمائندہ منتخب کر لیا گیا۔ بعد انتخاب سب اراکین نے نئے نمائندہ کو مبارک باد دی۔ انہوں نے تمام ممبران سے درخواست کی کہ وہ بزم کی ترقی کے لئے پورا پورا تعاون کریں۔

سابق نمائندہ محمد شریف لون تبدیل ہو کر لائل پور چلے گئے ہیں۔ بزم کی طرف سے اُن کو ایک شاندار الوداعی پارٹی دی گئی۔ گروپ فوٹو لئے گئے اور اراکینِ بزم طلوع اسلام سرگودہا کی طرف سے ان کو ایک نہایت قیمتی قلم بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ جوابی تقریر میں سابق نمائندہ نے تمام اراکینِ بزم کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہمیشہ دستِ تعاون بڑھاتے رکھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں اس بیش قیمت

اور یادگاری قلم کو ہمیشہ ایک حسین یاد کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔

بزم کا ہفتہ وار درس ہر اتوار کو ساڑھے پانچ بجے شام باقاعدہ طور پر جاری ہے۔ بلکہ اتوار کے علاوہ ایک دوسری نشست کا بھی شائقین کے لئے انتظام کر دیا گیا ہے۔ لوگ خاطر خواہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

رسالوں کی تقسیم کا سلسلہ بڑے احسن طریقہ پر جاری ہے۔

محترم محمد شریف لون صاحب نے جس عزم و ہمت سے بزم سرگودھا کو ایک فعال جماعت میں تبدیل کر دیا ہے اس کے لئے وہ بجا طور پر اس احترام کے مستحق تھے جس کا اظہار ان کی بزم نے ان کی تشریف براری کے وقت کیا۔ امید ہے کہ محترم ارشد صاحب ان کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔

بزم مردان

بزم مردان کے نمائندہ محترم عبدالحکیم خان صاحب (جنہیں بزموں کی تشکیل کے سلسلہ میں السابق الاول ہونے کی سعادت حاصل ہے) اپنی طبعی منکسر المزاجی کی بنا پر، بزم کی کارکردگی کی رپورٹ میں، ہمیشہ حجابانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ بزم حسب سابق سرگرم عمل ہے۔ کتابیں اور پمفلٹ باقاعدگی سے تقسیم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، بزم کے زیر اہتمام، درس قرآن کریم کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری ہے۔ آج کل سورۃ النحل زیر درس ہے۔ یہ درس محلہ پیر عبدالخالق۔ بکٹ گنج میں، آٹھ بجے شب سے نو بجے شب تک ہوتا ہے۔ رابطہ پیدا کرنے کے لئے میسرز عبداللطیف، محمود علی۔ صدیقیہ انجینئرنگ ورکس، بنیک روڈ مردان کی طرف رجوع کیا جائے۔

دیگر بزمیں

طلوع اسلام کی ہر بزم اپنے اپنے مقام پر، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ لاہور اور کراچی کے علاوہ، پرویز صاحب کا (ٹیپ ریکارڈ)، پر درس قرآن کریم، ملتان، لیہ۔ سرگودھا۔ لائل پور۔ سید حسن اور بریڈفورڈ (انگلستان) میں باقاعدگی سے سنایا جاتا ہے۔ بریڈفورڈ کی بزم کے حسن اہتمام کی بدولت، انگلستان کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں پاکستانی باشندوں کی آبادی زیادہ ہے، فکر قرآنی کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور اس کی طرف احباب بڑے ذوق و شوق سے رجوع کر رہے ہیں۔ اس بزم سے ماہنامہ طلوع اسلام اور پرویز صاحب کی تصنیفات بھی مل سکتی ہیں۔ بزم کے نمائندہ، محترم دین محمد صاحب اور ان کے رفقائے کار مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مغرب کے ظلمتکدہ میں شمع قرآنی کے روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ واللہ المستعان!

حقائق و عبر

فحاشی کا سرچشمہ

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اٹھتے بیٹھتے اس مقدس وعظ کو دہراتا رہتا ہے کہ ملک میں فحاشی کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے۔ قوم کا نوجوان طبقہ۔ جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتا ۔۔ یا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکلتا ہے ۔۔ وہ فحش نگاری، فحش گوئی، فحش بینی اور فحش جوئی کا رسیا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی غلط تعلیم، بیرونِ ملک سے درآمد ہونے والا عریاں لٹریچر اور ریڈیو، ٹیلی وژن اور سینما کے جنسی محرکات ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف آئے دن جہاد کا اعلان کرتا رہتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فحاشی بڑی مخربِ اخلاق شے ہے اور ہر وہ حرف و صوت یا نقش و تمثال جو ان جذبات میں تحرک وارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو، قابلِ احتراز ہے لیکن ہمارا مذہب پرست طبقہ جس انداز سے فحاشی کی مخالفت کرتا ہے اس سے وہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فحاشی کا سرچشمہ "دنیاوی" تعلیم اور اس کے تضمنات ہیں۔ جو تعلیم ان کے مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے' اس سے عفتِ فکر و نظر کے پیکر اور عصمتِ قلب و نگاہ کے مجسمے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات نہایت پاکیزہ، اور تصورات انتہائی مقدس ہوتے ہیں۔ لیکن آئیے اور ذرا دیکھئے کہ ان دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ اور یہ کیفیت کسی مسٹر کی زبان سے نہ سنیئے۔ اس کے بیان کرنے والے' مولانا عبدالغفار حسن ہیں جو (جماعتِ اسلامی سے اعتزال کے بعد) مدینہ یونیورسٹی میں قیام پذیر ہیں۔ ان کا ایک مضمون (یا خط) ہفتہ وار المنبر کی ۲۷ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"گزشتہ ماہ المنبر کا شمارہ ملاحظہ میں آیا جس میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی سوانح عمری کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ حضرت موصوف کے یہ الفاظ کتنے بصیرت افروز ہیں: "از خواندن ابیات و شنیدن آں پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ دنا، زبان است"

ایک طرف یہ پاکیزہ نقطۂ نظر ہے، دوسری طرف ہمارے ہاں کے درسِ نظامی، سبعہ معلقہ اور متنبی جیسی فحش اور عشقیہ اشعار و قصاید پر مشتمل کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طور پر چونکہ دینی مدارس کا انتظام مساجد میں ہوتا ہے، اس لئے بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ محراب و منبر بھی ان اشعار و قصائد کی شرح و تفسیر سے گونج اٹھتے ہیں اور طلبا بھی اپنی جلوت و خلوت میں مزے لے لے کر جھوم جھوم کر ان کو پڑھتے ہیں اور اپنی دبی آگ کو بھڑکانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ استاد اگر دینی غیرت اور شرم و حیا کی بنا پر ان کتابوں کے فحش اشعار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو طلبہ بضد ہوتے ہیں کہ ہم ان اشعار کے ترجمے اور شرح و تفصیل سے محظوظ ہو کر ہی رہیں گے۔ چوں فسق از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

غور طلب امر یہ ہے کہ یہی اشعار یا ان کا منظوم ترجمہ ریڈیو پر ترنم کے ساتھ کوئی مغنیہ پڑھ کر سنا دے تو کس بنا پر اسے مخربِ اخلاق اور شرم و حیا کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ریڈیو کی اس قسم کی نشریات اپنا وسیع حلقہ رکھتی ہے اور شرابِ دو آتشہ سے آتشہ کی شکل میں معاشرہ کے فساد کا ذریعہ بنتی ہے۔ عربی مدارس کی فضا میں حلقۂ سامعین انتہائی محدود ہوتا ہے لیکن افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ یہ زہر ان کو پلایا جاتا ہے جو آئندہ قوم کے مرشد اور دینی رہنما بننے والے ہیں اور ساقی کا منصب ان کو حاصل ہے جو تقویٰ اور دینی علم سے بہرہ ور ہیں۔

اس قسم کی کتابوں کو جزوِ نصاب بنانے کے بارے میں عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عربی زبان اور قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے ان کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ناگزیر ہے۔

یہ جواب چند وجوہ سے قابلِ غور ہے۔

(۱) دیوان متنبی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے اشعار بطور سند پیش کئے جا سکیں۔ یہ تو اس دور کی یادگار ہے۔ جبکہ عجمی تخیلات اور اسالیبِ کلام، عربی ادب میں سمو دیئے گئے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس میں بعض حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے استفادہ اگر ضروری خیال کیا جاتا ہے تو اس کتاب کے منتخب اشعار پڑھا دینے مناسب ہوں گے۔ باقی رہی "سبعہ معلقہ" تو اس کے ہر قصیدے میں سے موزوں اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ درجہ تخصص میں اسے مطالعہ میں رکھا جائے تاکہ جاہلی ادب اور

اسلامی ادب کا فرق واضح ہو سکے۔

افسوس ہے کہ ہمارے مدارس میں یہ کتاب عام طور پر تیسرے یا چوتھے سال میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان درجات میں اکثر طلبہ نوعمر ہوتے ہیں۔ ان اشعار سے ان کے اخلاق پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ انہوں نے دو نوعمر طالبات کو "عالم عربی" کی تیاری کی غرض سے "سبعہ معلقہ" پڑھانا شروع کی۔ جب امرئ القیس کے فحش اشعار کے پڑھانے کی نوبت آئی تو شرم و حیا کی بنا پر زبان ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ آخر کار انہوں نے اس مشغلے کو خیرباد کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ بعد میں ان طالبات نے "عالم عربی" کے امتحان کے لئے مدرسۃ البنات لاہور (سابق جالندھر) میں داخلہ لیا۔ سنا ہے کہ وہاں سن ورا حجاب (پس پردہ) مرد اساتذہ طالبات کو درس دیتے ہیں۔ نہ معلوم وہ کس طرح ان اشعار کو نگلواتے ہوں گے۔"

مولانا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں۔

یہ تفصیل حصہ نظم کے بارے میں عرض کی گئی ہے۔ اب حصہ نثر کا حال ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں پاک و ہند کے مدارس میں حصہ نثر کے لئے نفحۃ الیمن اور مقامات حریری تجویز کی گئی ہیں ان میں جو حکایات اور افسانے درج ہیں ان سے انتہائی گھٹیا کردار سامنے آتا ہے۔ حریری کے افسانے زیادہ تر گداگر واعظ کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کی تحریروں سے طلبہ اچھا تاثر لے سکتے ہیں۔

مولانا صاحب نے اپنی تنقید کو صرف عربی ادب کی دو چار کتابوں تک محدود رکھا ہے۔ اگر یہ جرأت سے کام لے کر کتب فقہ کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیتے۔ اور مزید ہمت کر کے، ان کے کچھ اقتباسات پیش کرتے، تو پھر اس کا صحیح اندازہ ہوتا کہ ان مکتبوں اور مدرسوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے کس قسم کے ذہن تیار ہوتے ہیں۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ زیادہ نہیں تو عالمگیری، ہدایہ، شرح وقایہ، درمختار وغیرہ سے' وضو، غسل، روزہ یا نکاح سے متعلق ابواب کے دو دو، چار چار مسائل سامنے لا کر بتائیں۔ کہ ان سے نوجوان (اور بالعموم مجرد) طالبعلموں کے دل میں کس قسم کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں۔ یا کوئی اور صاحب ہمت بزرگ ایسا کر سکیں تو یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

۲۔ مُلّا کا چھوئی موئی کا اِسلام

ہفت وار جریدہ ایشیا کی ۳۰ اگست کی اشاعت میں 'درس قرآن وحدیث کے بعد'

ایک صاحب کا مودودی صاحب سے سوال اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔ پہلے سوال ملاحظہ فرمائیے۔

کیا محکمہ موسمیات کا وجود قرآن و حدیث کی رو سے جائز ہے۔ اس کے ماہرین پیشین گوئی کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ آج بارش ہونے کا امکان ہے یا مطلع صاف رہے گا۔ وغیرہ۔

سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اب مودودی صاحب کی طرف سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ فرمایا:۔

جس روز محکمہ موسمیات کے ماہرین یہ کہیں گے کہ آج بارش ضرور ہوگی، اسی روز اس محکمے کا وجود ناجائز ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ آج بارش ہونے کا امکان ہے اور اس کی مختلف وجوہ بھی بیان کرتے ہیں تو یہ ناجائز نہیں۔

یعنے مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ جب تک انسانی علم ناقص رہے، وہ اسلام کی رو سے جائز ہوتا ہے لیکن جب وہ یقینی درجہ تک پہنچ جاتے تو وہ ناجائز ہو جاتا ہے۔ ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب ماہرین علم الافلاک، یہ کہتے ہیں کہ آج سے سو سال بعد، اتنے بجکر اتنے منٹ اور سیکنڈ پر چاند یا سورج کو گرہن لگے گا اور اس کی کمیت اور کیفیت ایسی ہوگی۔ اور وہ گرہن ٹھیک اسی وقت اسی تفصیل کے ساتھ، واقعہ ہو جاتا ہے تو یہ علم، اسلام کی رو سے جائز ہوتا ہے یا ناجائز؟

انہیں کون بتلائے کہ کائنات میں جو کچھ قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے، اس کے حتمی اور یقینی علم کے حصول کا امکان، انسان کو حاصل ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (ارض و سما میں جو کچھ ہے خدا نے اسے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے) اور عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (جملہ اشیائے کائنات کا علم آدمی کو ودیعت کر کے دے دیا گیا ہے) سے یہی مراد ہے۔ قوانین فطرت میں سے جس کے متعلق انسان کا علم ناتمام ہوتا ہے، اس کے متعلق وہ یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن جب اس کا علم تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کے متعلق حتم و یقین سے متعین بات کر سکتا ہے۔ اور اس خود اعتمادی کے لئے اس کے پاس خدا کی یہ شہادت اور یقین دہانی موجود ہوتی ہے، کہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ "تو قوانین خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔" قوانینِ خداوندی کی یہی وہ محکمی ہے جس کی بنا پر آج انسان، زمین پر بیٹھے، چاند کو اپنا مرکب بنا رہا ہے۔ لیکن۔

اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

آج اگر محکمۂ موسمیات کے اربابِ کار، بارش وغیرہ کے متعلق محض امکانی حد تک بات کرتے

ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سائنس ہنوز پختگی تک نہیں پہنچی جس دن یہ تکمیل تک پہنچ گئی، یہ بھی اسی حتم و یقین سے اعلان کیا کریں گے جس یقین کے ساتھ علم الافلاک کے ماہرین، چاند یا سورج گہن کے متعلق بات کرتے ہیں۔ اور یہ سب خدا کے متعین فرمودہ قوانین اور اس کے عطا کردہ علم کے مطابق ہوگا۔ یہ علوم، حجروں کی تاریکیوں میں بیٹھ کر جاری کردہ فتاویٰ کے محتاج نہیں ہوتے۔

سورۂ لقمان میں تین باتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ انسان کو ان کا علم نہیں ہو سکتا یعنی علم الساعۃ، اس بات کا علم کہ انسان کل کیا کریگا۔ اور یہ کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ اس آیت (۳۱/۳۴) میں جو بارش اور جنین کا ذکر ہے تو ان کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ ان کا علم صرف خدا کو ہے۔ انسان یہ علم حاصل نہیں کر سکتے۔

باقی رہا "جائز و ناجائز" کا سوال ۔ سو وہ کون سی نئی ایجاد ہے جسے ان حضرات نے شروع میں ناجائز (بلکہ حرام) قرار نہیں دیا۔ اور ان میں سے کونسی چیز ہے جسے بعد میں انہوں نے خود ہی استعمال و اختیار نہیں کیا!

اور مودودی صاحب کے ہاں تو "جائز و ناجائز" بازیچۂ اطفال ہے۔ یہ لبسا طِ سیاست کے ایسے چابکدست مہرہ باز ہیں کہ ان کے ہاں آئے دن جائز و ناجائز کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔ آج جس چیز کو ان کی مصلحت کوشی ناجائز اور حرام قرار دیتی ہے کل وہی شے ان کی مفاد پرستی کے پیش نظر جائز (بلکہ واجب) قرار پا جاتی ہے۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد!

۳۔ بنا کردند خوش رسمے

اخبارات میں شائع شدہ یہ خبر کس قدر باعث مسرت اور وجہ شادمانی ہے کہ یوم دفاع کے سلسلہ کی تقریبات میں تلاوتِ قرآن مجید، مُلّا کی بجائے، پاک فضائیہ کے افسروں نے خود کی، پشاور میں یہ تلاوت ایئر مارشل نور خاں صاحب کی زبان سے سنی گئی۔ ہم محترم ایئر مارشل اور ان کے جملہ افسران کی خدمت میں، اس صحیح اسلامی انداز کے لئے، تہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں ۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا وجود، اسلام میں ایک غیر اسلامی بدعت ہے اور جب تک قوم اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتی، وہ مصافِ زندگی میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اسلام کے صدرِ اول میں آپ کو مولوی اور مولانا کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ حتیٰ کہ اس دور کے لٹریچر میں یہ الفاظ بھی آپ کو نہیں ملیں گے۔ اُس دور میں، دارالسلطنت (مدینہ) میں خود امیر المومنین

(باقی صـ۱۶ پر)

بچت کی بات

منافع میں اضافہ

کھاتے کی قسم	موجودہ شرح	پرانی شرح
سیونگ	۳ فیصد	۲½ فیصد
ایک سال کی مقررہ مدت کیلئے	۳½ فیصد	۳ فیصد
دو سال کی مقررہ مدت کیلئے	۵ فیصد	۴½ فیصد
تین سال کی مقررہ مدت کیلئے	۵½ فیصد	۵ فیصد

جمع کی حد میں اضافہ

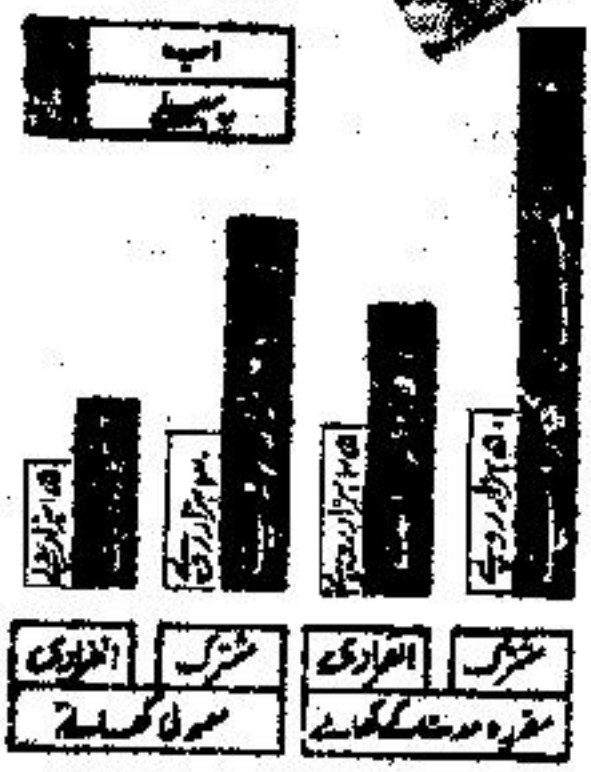

پوسٹ آفس سیونگ بنک میں جمع کی جانے والی تمام رقوں پر نہ صرف منافع کی شرح میں یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے اضافہ ہو گیا ہے۔ بلکہ تمام کھاتوں میں جمع کی جا سکنے والی رقوں کی زیادہ سے زیادہ حد بھی دگنی کر دی گئی ہے۔

پوسٹ آفس
سیونگ بینک

رقم بار بار
بچت کیجئے
اپنے وطن کے لئے

O.P.P. 112/66

MAKFA

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ اندازمیں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیب ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام / ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ آرا تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے
اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا
ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں
ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے
ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح
صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور
ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی
جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد
(پانچ روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت
کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے
فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں
نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے
مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔
عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور
واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے
قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت
کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین
کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو
پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی
تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد
بارہ روپے۔ بعض حصے چھپ رہے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ
کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی
خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف
گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں
عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت
کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے
بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی۔ سیاسی
نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد
کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا
صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے
سستا ایڈیشن - چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور